1105

سلسلۂ مطبوعات کتابخانۂ ریاست رامپور، نمبر ۳

انتخاب غالب رحمہ

یعنی نجم الدولہ دبیر الملک، میرزا اسد اللہ خان بہادر، نظام جنگ دہلوی المتخلص بہ
غالب و اسد کے کلام فارسی و اردو کا انتخاب، جسے خود موصوف نے
نواب خلد آشیاں کی فرمایش پر سنہ ۱۸۶۶ع میں مرتب کیا

بتصحیح

امتیاز علی عرشی
ناظم کتابخانہ

حسب الحکم فرمانروای رامپور، دام اقبالهم و ملکهم

مطبعۂ قیّمہ ـ بمبئی
(مالکان: شرف الدین الکتبی واولادہ)

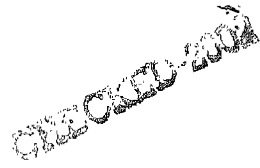
۱۹۴۲

(جملہ حقوق محفوظ ہیں)





بارِ اول ۱۹۴۲

فہرست مضامین

فہرست مضامین

بسم اللہ الرحمن الرحیم

تقریب

نواب خلد آشیاں (طَابَ ثَرَاہُ) نے، فارسی و اردو کے چیدہ اشعار کی ایک بیاض مرتب فرمانے کے سلسلے میں، میرزا اسد اللہ خان غالب سے فرمایش کی کہ اپنے اردو اور فارسی کلام کا انتخاب ارسال کر دیجے، تا کہ اُسے شاملِ بیاض کر لیا جائے۔ ستمبر سنہ ۱۸٦٦ع میں، میرزا صاحب نے اِس ارشاد کی تعمیل کی، اور یکے بعدِ دیگرے کلیاتِ اردو و فارسی کے خود کردہ انتخابات جدا گانہ کتابی صورت میں نقل کرا کے، نواب خلد آشیاں کے حضور میں ڈاک کے توسط سے پیش کیے۔

سرکار کے ملاحظے کے بعد، یہ دونوں نسخے کتابخانے کو بھیج دیے گئے۔ اُس عہد کے منتظمینِ کتابخانہ نے،

صرف فارسی انتخاب کو شعبۂ دواوین میں داخل ہونے کا شرف عطا کیا، اور رسمِ زمانہ کے مطابق، انتخابِ اردو کو ناقابلِ التفات خیال کر کے، کتابخانے کے «ردی گھر» میں گمنامی کی گہری نیند سلا کر مطمئن ہو گئے. حسنِ اتفاق سے، مولوی امتیاز علی خاں عرشی، ناظمِ کتابخانہ، نے «ردی گھر» کی متاعِ کاسد کا جائزہ لیتے ہوے، دوسرے نوادرات کیساتھ اردو انتخاب بھی برآمد کر لیا، اور میرزا صاحب کی تھکی ہوئی زندگی کا یہ کار نامہ، ملک کے اربابِ ذوق کے لیے محفوظ ہو گیا.

گو میرزا صاحب اپنا اردو اور فارسی دیوان خود شائع کر چکے تھے؛ لیکن اُنھیں اپنی فارسی زبان کی محنت پژوھی اور جگر کاوی پر زیادہ ناز تھا، حتّٰی کہ ایک معاصرانہ طعن کے جواب میں یہ کہ اُٹھے تھے:

فارسی بین، تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو کہ بیرنگِ منست

میرزا صاحب کا یہ ادّعا بے بنیاد نہیں تھا؛ اسی لیے خواجہ حالی مرحوم نے «یاد گارِ غالب» میں فارسی

کلام کے محاسن زیادہ اُجاگر کیے. مگر ملک میں اردو زبان کے پیہم عروج نے، جس کے اثر سے خود خواجه صاحب بھی بخوبی آگاہ تھے، اهلِ ادب کی توجه دیوانِ اردو کی طرف منعطف کی، اور رفته رفته غالب پسندی اس درجے تك پہنچ گئی که هندوستان نے «مرقعِ چغتائی» جیسے گراں قیمت نسخے کو بھی هاتھوں هاتھ خرید لیا.

اگر بغور دیکھا جائے تو اردو کلام کے مقابلے میں فارسی کی نا مقبولیت کے اندر، پسِ پرده یه حقیقت بھی کام کر رهی تھی، که میرزا صاحب نے اردو دیوان کی طرح اپنے فارسی اشعار کا کوئی منتخب مجموعه اهلِ ذوق کے سامنے نہیں رکھا تھا، جس کا نتیجه یه نکلا که اُن کے فارسی اشعار کے بے بہا موتی کم قیمت جواهرات کے انبار میں پوشیده پڑے رهے. خوش بختی سے، کتابخانۂ عالیۂ رامپور میں زیرِ نظر انتخاب کے دستیاب هو جانے سے، جو میرزا صاحب کے ادوارِ عمر میں سے پخته تر دور کا کارنامه هے، یه کمی بخوبی پوری هو گئی.

اسلیے بعید نہیں کہ اس انتخاب سے سخن سنجوں پر میرزا صاحب کی فارسی شعرگوئی کے مخفی جوہر کھل جائیں، اور اسطرح اُن کی وہ آرزو، جو ابتک شرمندۂ تکمیل نہ ہو سکی تھی، اس کی بدولت بر آئے۔

پرورشِ علم و ادب کے موروثی جذبے، نیز اس انتخاب کی ادبی اہمیت کی بنا پر، بندگانِ حضورِ پر نور، میجر ہز ہائنس عالیجاہ، فرزندِ دلپزیرِ دولتِ انگلشیه، مخلص الدوله، ناصر الملك، امیر الامرا، نواب سر سید محمد رضا علی خان بہادر، مستعد جنگ، کے۔سی۔ایس۔آئی، ایل۔ایل۔ڈی، ڈی۔لٹ، فرمانروای ریاستِ عالیۂ رامپور، دَامَ اِقبالُهُمْ وَ مُلْکُهُمْ، کی همایوں توجه اس کی اشاعت کی طرف مبذول ہوئی۔

عرشی صاحب نے «مکاتیبِ غالب» کی ترتیب میں جس حسنِ کار اور خوش سلیقگی کا ثبوت دیا تھا، ملك کے مستند ادیب اور نقاد خوش آیند الفاظ میں اُس کا اظہار کر چکے تھے۔ بنابریں «انتخابِ غالب» کی تصحیح و ترتیب کا کام بھی زیرِ نگرانیء عالیمرتبت

صاحبزادہ عبد الجلیل خان بہادر، ہوم منسٹر، انھیں کے سپرد کیا گیا. ان کی چند سال کی دیدہ ریزی اور کوشش کے بعد یہ مجموعہ اس قابل ہوا ہے کہ اپنی صوری و معنوی خوبیوں کی بدولت بندگانِ ہمایوں کی بارگاہِ معلّٰی میں پیش کیا جائے.

التجا ہے کہ اعلیٰ حضرت اس حقیر ادبی کوشش کو طغرای قبول سے مزیّن و مفتخر فرمائیں، اور دعا ہے کہ سرکار کے زیرِ سایہ اس قسم کی بیشمار کوششیں بار آور ہوں!

دوام دولت و اقبال کا داعی
بشیر حسین زیدی
چیف منسٹر

سیکریٹری ایٹ، رامپور
۱۰ دسمبر سنہ ۱۹٤۱ ع

بسم اللہ الرحمن الرحیم

دیباچه

اردو شاعری نے اپنی چھوٹی سی عمر میں جس قدر ترقی کی، مشرقی شعر و سخن کی دنیا میں اُس کی نظیر تلاش کرنا بیکار ہے. خالص عاشقانہ چھیڑ سے اعلیٰ صوفیانہ جذبات تك، اور انتہائی سادگی سے الفاظ و معانی کے حوصلہ فرسا اغلاق و پیچیدگی تك، کوئی ایسا اندازِ بیان اور طرزِ تخییل نہیں، جو ہندی سخنوروں کے دسترس سے باهر رها هے.

بیشك عربی شعر کی معنوی خصوصیت اردو میں شاذ و نادر هے، جس کی وجه یه هے که عربی داں بزرگوں میں شاعرانه خیالات کے بیباك اظهار کی جرأت نه تهی، اور غیرِ عربی داں شاعر سُنی سنائی باتوں سے ماهرانه کام نہیں لے سکتا تها. لیکن فارسی ادب کی هزار ساله شکست و ریخت کا نتیجه: سعدی کی سادگی، حافظ کا ولوله و جوش، خسرو اور حسنِ سنجری کا معامله، جامی کا تصوف، فغانی و نظیری و عرفی کی پُرکاری اور شوکت و اسیر و بیدل کی بوسه به پیغامی، اردو شاعری میں دو ڈهائی سو سال کے اندر هی اُجاگر هو چکی هے، اور آج هر کافرِ ادب سے بلا خوفِ تردید کہا جا سکتا هے که

دیباچه

مشو منکر، که در اشعارِ این قوم
ورای شاعری، «چیزی دگر» هست

سوال یہ ھے کہ اتنی کم مدت میں اسقدر عظیم الشان سرمایۂ ادب کس طرح جمع ہو گیا؟

اگر اردو شاعری کی تاریخ کا گہرا مطالعہ کیا جائے، تو اس میں ابتدا سے دو قسم کے شاعر نظر آئیں گے: ایك جماعت ایسی دکھائی دے گی، جو بیرونی علوم و آداب سے برای نام واقف تھی، اور دوسری جماعت ایسی ملے گی، جسے عربی و فارسی میں سے دونوں کے اندر، یا علی الاقل صرف فارسی میں یدِ طولیٰ حاصل تھا۔ ان گروھوں میں سے اول الذکر کی تعداد اب سے چالیس پچاس سال اُدھر تك بہت کم تھی؛ کیونکہ انگریزی زبان کے تسلط و اقتدار سے پہلے، تعلیم کا ادنیٰ معیار فارسی دانی تھی۔ چونکہ فارسی زبان کا بڑا سرمایہ اُس کی شاعری ھے اور ھر ایك فارسی پڑھنے والے کو اس زبان کے چیدہ شاعروں کا بہترین کلام نصاب میں پڑھایا جاتا تھا، اس امر کے پیشِ نظر غور کیجیے کہ ایك طالبِ علم نے پند نامۂ سعدی سے شروع کر کے، سکندر نامۂ نظامی یا شاھنامۂ فردوسی تك، مثنوی، غزل اور قصیدے کے کئی ھزار شعر سبقاً سبقاً پڑھے اور روزانہ مطالعہ و بحث کے دوران میں اُن پر غور و فکر کی، تو کیا سات آٹھہ برس کی مسلسل ادبی جِدّ و جَہد نے بساطِ ادب کے ان تازہ واردوں کے سوئے ھوئے جذبۂ شعر کو

بیدار نه کیا ہوگا؟ اور کیا یه نیم رس گروہ ، تعلیم سے فراغت کے بعد ، اپنے دماغ کے نرم و نازك پردوں سے اس پُر سوز و ساز صنفِ کلام کے نقوش مٹانے میں کامیاب ہو سکا ہوگا؟ عملاً اس امر کے محال ہونے کی وجه سے یه ماننا پڑیگا که ہندوستان میں فارسی شعرگوئی کی تحریك اور اُس کی حیرت انگیز ترقی میں نصابِ تعلیم کو بڑا دخل رہا ہے . اور خالص ہندوستانی اہلِ ذوق کی فارسی زبان میں سخن گستری کا راز یه ہے که اُنھوں نے دورانِ تعلیم میں سب سے زیادہ اسی صنفِ کلام کا مطالعه کیا اور اس لیے اسی دریا کے اُتار چڑھاؤ سے اُنھیں زیادہ آگہی حاصل تھی ؛ حتیٰ که بسا اوقات ملکی ماحول کی معمولی جھلك بھی اُن کے کلام میں نظر نہیں آتی تھی .

ایجاد و ترقیء ریخته

لیکن ہندوستان میں ، فارسی شعرگوئی کے آغاز ہی سے ، مسعودِ سعدِ سلمان لاہوری اور امیر خسرو دہلوی کی طرح ، ہندی اور فارسی دونوں زبانوں میں شعر کہنے والے شاعر موجود تھے . ان جداگانه راہوں کی گلگشت سے طبیعت سیر ہوگئی ، اور ذوقِ شعر کو نئی راہ کی تلاش کا خیال پیدا ہوا ، تو جدّت پسند دماغوں نے فارسی عروض اور قافیے کی پابندی کے ساتھه ، دیسی روزمرے میں ایك نئی روش کی بنا ڈالی اور اُس کا نام «ریخته» رکھا . اس مشغلے نے ، جو آغاز میں صرف دل کا بہلاوا تھا ، انجام میں ایسے شاعر بھی پیدا

کیے، جو اسے سنجیدگی کی نظر سے دیکھتے اور فارسی کے ساتھہ اس میں بھی طبع آزمائی کرتے تھے. رفته رفته بدیسی شعرگوئی کا رواج گھٹتا گیا اور هندوستان کے ذوقِ شعر کا انحصار صرف شعرِ ریخته پر رہ گیا.

چونکه ابتدائی ریخته گو، فارسی کے بھی سخنور یا تعلیم یافته تھے اور اُن کے پیشِ نظر اس زبان کے هر دور کے استادوں کا کلام رهتا تھا، اس لئے ریخته کہتے وقت اُن کے دماغ نے وهی خیال زبان کے سپرد کیا، جو بدیسی زبان میں بارها پڑھا اور کہا تھا، اور جس کی چمك دمك سے اُن کے دماغ کا گوشه گوشه روشن هو چکا تھا. اس کا نتیجه یه نکلا که مختلف مذاق کے شاعروں کی لگاتار کوشش سے، فارسی کی هزارساله ترقی کے تمام اثرات ریخته میں پیدا هو گئے. میرے نزدیك یه وجه هے اردو شعر و سخن کی کم عمری میں زیاده ترقی کرنے کی اور اسی پر میں اپنے اس خیال کی بنیاد رکھتا هوں که اردو شاعروں میں جو اچھا فارسی گو تھا، وهی اردو میں بھی بلند پایه اور عالی رتبه مانا گیا اور فارسی گوئی کے درجوں کے تفاوت کے اعتبار سے اردو شعر و سخن کی خوبی و برتری کے درجات بھی همیشه متفاوت رهے هیں. چنانچه میرے نزدیك، خواجه میر درد، میرزا رفیع السودا، میر تقی میر، مفتی صدر الدین خاں آزرده، حکیم مومن خاں، نواب مصطفیٰ خاں شیفته، اور خود میرزا غالب کی بلندیء ذوقِ سخن کا یهی راز هے، اور یهی وجه هے همارے

زمانے کے دو سب سے بڑے شاعروں: خواجہ الطاف حسین حالی اور علامۂ اقبال مرحوم کی برتری اور سربلندی کی۔

غالب کا دعوی

آج میرزا غالب کو اردو شاعروں کی پہلی صف کا رہنما تسلیم کیا جاتا ہے۔ لیکن وہ خود، کلامِ ریختہ کو اپنے لیے موجبِ ننگ اور فارسی کو باعثِ فخر خیال کرتے تھے۔ چنانچہ ایک قطعے میں فرماتے ہیں:

ای کہ در بزمِ شہنشاہِ سخن رس گفتۂ!
«کی بہ پرگوئی، فلان در شعر ہم سنگِ منست؟»
راست گفتی، لیک میدانی کہ نبود جای طعن
کمتر از بانگِ دہل، گر، نغمۂ چنگِ منست
نیست نقصان، یک دو جزو ست، ار، سوادِ ریختہ
کان دژم برگی ز نخلستانِ فرہنگِ منست
فارسی بین، تا بہ بینی نقشہای رنگ رنگ
بگزر از مجموعۂ اردو، کہ بیرنگِ منست
فارسی بین، تا بہ بینی، کاندر اقلیمِ خیال
مانی و ارژنگم، آن مجموعہ ارتنگِ منست

اس خیال میں اُنہیں اس درجہ غُلو پیدا ہو گیا تھا، کہ اپنے کلیاتِ فارسی کو الہامی صحیفہ اور ایزدی کتاب قرار دیتے تھے۔ چنانچہ جب ۴۱ برس کی عمر میں اُس کی ترتیب سے فارغ ہوئے، تو خاتمے میں اس نغمے پر تان توڑی تھی:

گر شعر و سخن بدهر آئین بودی
دیوانِ مرا شہرتِ پروین بودی
غالب، اگر این فنِ سخن دین بودی
آن دین را ایزدی کتاب این بودی

ممکن ہے، موجودہ عہد میں، جب کہ فارسی شعر و سخن کی محفل اُجڑ چکی ہے اور اس آتشِ بے دود کے شعلے ٹھنڈے پڑ چکے ہیں، اُن کا دعویٰ تسلیم نہ کیا جائے؛ لیکن میرزا صاحب کے معاصر نکتہ سنج، اسے بے چون و چرا مانتے تھے. نواب مصطفیٰ خاں شیفتہ، جو اُن کے دوستوں میں بڑے بلند رتبہ سخنور اور قابلِ استناد سخن سنج تھے، اور جنکے متعلق اُنہوں نے ایك مقطع میں اعتراف کیا ہے کہ

غالب، بفنِ گفتگو، نازد بدین ارزش، که او
ننوشت در دیوان غزل، تا مصطفیٰ خان خوش نکرد

گلشنِ بیخار میں لکھتے ہیں[1] :

« در زبانِ فارسی نیز دستگاهی بلند و مایهٔ وافر بہم رسانیده، پایه اش از فحولِ استادان کم نیست. غزلش، چون غزلِ نظیری، بینظیر و قصیده اش، چون قصیدهٔ عرفی، دلپزیر . . . بالجمله چنین نکته سنجِ نغزگفتار کمتر مرئی شده ».

(۱) کتاب مذکور : ۱۸۶ ، طبع دهلی ، ۱۸۳۷ع .

خواجه حالی مرحوم، جو میرزا صاحب کے مایۂ ناز شاگرد اور بڑے نکته رس نقاد تھے، فرماتے ھیں[1]:

«وہ شخص جس کا قصیدہ انوری و خاقانی کے قصیدوں سے ٹکر کھائے، جس کی غزل عرفی و طالب کی غزل سے سبقت لیجائے، جو رباعی میں عمرِ خیام کی آواز میں آواز ملائے، اور اُس کی نثر کے آگے، ابو الفضل اور ظہوری کی نثریں پھیکی اور بے مزہ معلوم ہوں».

خود میرزا صاحب نے بھی اس کا اعتراف کیا ھے کہ اُن کے کلامِ اردو کی شمع نے فارسی ذوق سے کسبِ ضو کیا ھے. چنانچه ایك خط میں لکھتے ھیں:[2]

«قبله! ابتدای فکرِ سخن میں بیدل و اسیر و شوکت کے طرز پر ریخته لکھتا تھا، چنانچه ایك غزل کا مقطع یه تھا:

طرزِ بیدل میں ریخته کہنا اسد الله خاں، قیامت ھے

پندرہ برس کی عمر سے پچیس برس کی عمر تك مضامینِ خیالی لکھا کیا. دس برس میں بڑا دیوان جمع ھو گیا. آخر جب تمیز آئی، تو اس دیوان کو دور کیا، اوراق یك قلم چاك کیے، دس پندرہ شعر واسطے نمونے کے دیوانِ حال میں رھنے دیے».

یه قوتِ تمیزی، خود میرزا صاحب کے ارشاد کے مطابق اساتذۂ فارسی کے دواوین کے مطالعے کا نتیجه تھی. چنانچه

(۱) یادگار غالب: ۱۹۸، مطبع نامی کانپور، ۱۸۹۷ع. (۲) عود: ۱۵۹.

کلیاتِ فارسی کے خاتمے میں فرماتے ھیں:[1]

«شیخ علیِّ حزین، بخندۂ زیرلبی، بے راهه رویهای مرا در نظرم جلوه گر ساخت، و زهرِ نگاهِ طالبِ آملی، و برقِ چشمِ عرفیء شیرازی، مادۂ هرزه جنبشهای ناروا در پای ره پیمای من بسوخت. ظهوری، بسرگرمیء گیرائیء نفس، حرزی ببازوی و توشۂ بکمرم بست، و نظیریء لااُبالی خرام، بهنجارِ خاصۂ خودم، بچالش آورد. اکنون بیمنِ فره پرورشِ آموختگیء این گروهِ فرشته شکوه، کلکِ رقاصِ من بخرامش تدرواست و برامش موسیقار، بجلوه طاؤسست و بپرواز عنقا».

عہدِ حاضر میں میرزا صاحب کی شہرت و ناموری کا تمامتر مدار اُن کے دیوانِ ریختہ پر ھے. لیکن یہ اُن کے اصل دیوان کا انتخاب ھے. خوش بختی سے یہ دیوان بھی «نسخۂ حمیدیہ» کے نام سے ریاست بھوپال کی طرف سے شائع ھو چکا ھے. اس کے مطالعے سے یہ یقین ھوجاتا ھے کہ سخنورانِ کامل اس کے اشعار سنکر آسان کہنے کی فرمایش ضرور کرتے ھوں گے؛ ورنہ میرزا صاحب اس کا انتخاب کبھی نہ کرتے. اب یہ سوال پیدا ھوتا ھے کہ کیا میرزا صاحب کی موجودہ شہرت کا مدار اس قدیم دیوان کے طلسمی اشعار ھیں. منتخب دیوان ریختہ کے دیباچے سے اس خیال کی تردید ھوتی ھے، اس لیے

(۱) کلیات فارسی: ٥٥٤، مطبع نولکشور، لکھنؤ، ۱۸٦۳ع.

کہ میرزا صاحب نے اُس میں علی الاعلان کہدیا ہے کہ:

«امید کہ سخن سرایانِ سخنور ستای، پراگندہ ابیاتی را
کہ خارج ازین اوراق یابند، از آثارِ تراوشِ رگِ کلکِ این
نامہ سیاہ نشناسند، و چامۂ گرد آور را، در ستایش
و نکوهشِ آن اشعار، ممنون و ماخوذ نسگالند».[1]

تو کیا پھر وہ دس پندرہ شعر اُن کی برتری کا موجب ہوئے، جو دیوانِ حال میں نمونے کے لیے چھوڑ دیے گئے تھے؟ لیکن یہ عقیدہ بھی درست نہیں معلوم ہوتا، کیونکہ شیفتہ و حالی جیسے نقادانِ فن سے عرشی جیسے کم سواد تک، کوئی سخن فہم یہ یقین نہیں رکھتا کہ غالب کی فنی شخصیت کا ظہور:

نقشِ نازِ بتِ طناز بآغوشِ رقیب
پای طاؤس پیء خامۂ مانی مانگے

یا اسی قبیل کے دوسرے اشعار میں ہوا ہے. اس کے برخلاف ہر شخص کی رائے ہے کہ غالب ان جیسے اشعار میں جلوہ‌گر ہے:

پہلے آتی تھی حالِ دل پہ ہنسی ❊ اب کسی بات پر نہیں آتی
داغِ دل گر نظر نہیں آتا ❊ بو بھی، اے چارہ‌گر، نہیں آتی؟
جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد ❊ پر طبیعت ادھر نہیں آتی

اور یہ سب شعر اُس زمانے کے کہے ہوئے ہیں، جب اُن کا فارسی ذوق پختہ ہوچکا تھا اور وہ اپنے اردو کلام کے متعلق،

(۱) دیوان ریختہ: ۳، مطبع مفید خلایق، آگرہ، ۱۸۶۳ع.

جسے قبل ازیں «نخلستانِ فرهنگ» کا «برگِ دژم» قرار دے چکے تھے، یہ کہدینے پر مجبور ہوے تھے کہ:

جو یہ کہے کہ «ریختہ کیوں کہ ہو رشکِ فارسی؟»
گفتۂ غالب ایک بار پڑھکے اُسے سنا کہ یوں

انتخاب اشعار

جیسا کہ ابھی مذکور ہوا، میرزا صاحب نے اپنے ابتدائی اردو کلام کو ۲۵ سال کی عمر کے بعد خود منتخب کرکے ایک دو جزو کا چھوٹا سا دیوان مرتب کر لیا تھا. اس کے بعد میرزا صاحب ہمہ تن فارسی کی طرف متوجہ ہو گئے، اور ۱۸۵۰ع تک اسی شیوے کو نباہتے رہے. قلعۂ معلی کے تعلق نے ان کی توجہ پھر ریختے کی طرف منعطف کی اور ذوق کے انتقال پر استادِ شاہ کا اعزاز پانے کے بعد تقریباً اردو ھی میں کہنے لگے. اس زمانے میں دلی اور باھر کے بہت سے شاعروں نے اپنا اردو کلام اصلاح کے لئے بھیجنا شروع کیا، جس کے باعث سے اس روش کی ساخت و پرداخت میں زیادہ وقت گزرنے لگا. تاآنکہ سنہ ۱۸۵۷ع تک اتنا بڑا دیوان تیار ہو گیا، جس کا حجم ابتدائی دیوان کے انتخاب کے تقریباً برابر تھا. اس کے بعد میرزا صاحب کی شاعرانہ زندگی کی تخلیقی حرکت بڑی حد تک ختم ہو گئی.

یہ حقیقت ھے کہ کسی شاعر کا بھی سب کلام یکساں حیثیت کا نہیں ہوتا. شاعر کی زندگی کے تمام داخلی و خارجی

عوامل ، جو رفتارِ عمر کے ساتھہ پیہم تغیرپزیر رہتے ہیں ، شعر کے الفاظ اور معانی دونوں پر نمایاں اثر ڈالتے ہیں اور اس لیے پختگیء عمر کے ہر نئے مرحلے میں ، سابق نشانہای قدم پر انتقادی نظرڈالنا ضروری ہو جاتا ہے . میرزا صاحب کا آخری اردو کلام بھی اس کلّیّے سے مستثنی نہیں ہو سکتا تہا .

علاوہ ازیں ، اُن کا فارسی دیوان صرف ایك بار «گلِ رعنا» کی صورت میں شرمندۂ انتخاب ہوا تہا . اولاً تو اُس کے نسخے عام طور پر شائع نہ ہوے ، اس لیے اُس کے معیارِ انتخاب کا تعین دشوار ہے ؛[1] ثانیاً وہ خود میرزا صاحب کی اُس عمر کا کام ہے جب کہ وہ بادۂ نیمرس کی حیثیت رکھتے تھے اور ابھی اُن کے لیے ودیعت خانۂ غیب میں اشعارِ فارسی کی خاصی تعداد محفوظ تہی . ان وجوہ سے اردو اور فارسی دونوں زبانوں کے کلام پر شاعر کی آخری نظرِ انتخاب کی ضرورت باقی تہی .

آخری انتخاب

حسنِ اتفاق سے ، نواب خلدآشیاں نے اساتذۂ اردو و فارسی کے منتخب اشعار کی ایك بیاض ترتیب دینے کا عزم فرمایا . اس موقع پر سرکار کو یہ مناسب معلوم ہوا کہ میرزا صاحب کے کلام کا انتخاب خود اُنہیں سے کرایا جائے . ۲۵ اگست

(۱) مولانا حسرت موہانی نے شرح دیوان غالب کے آخر میں لکہا ہے کہ اس کا ایك نسخہ اون کے پاس محفوظ ہے . عرشی کے زبانی استفسار پر مولانا نے فرمایا کہ یہ اصل کتاب کا صرف ایك حصہ ہے .

سنہ ۱۸۶۶ع کو سرکار نے میرزا صاحب کو تحریر فرمایا:[1]

«مطلبِ دگر، جو کہ راقم کو ترتیب بیاضِ اشعارِ منتخبۂ اساتذۂ پارسی و اردو کی منظور ہے، اس واسطے حوالہ خامۂ محبت نگار کے ہوتا ہے کہ آپ انتخاب دیوانِ فارسی اور اردو اپنے کا فرما کر، مع انتخابِ کلامِ ضیاء الدین خانصاحب، لطف کریں، تا شامل انتخاب کے، جو اس سرکار میں عمل میں آیا ہے، ہو جائے۔»

میرزا صاحب نے ۱۸ ستمبر کو دیوانِ اردو اور ۲۴ ستمبر کو دیوانِ فارسی کا انتخاب ارسال کر دیا۔[2]

اردو انتخاب

اردو انتخاب ۱۲¼ × ۷¾ انچ ناپ کے ۶۴ صفحات پر مشتمل ہے۔ ان صفحوں کی سطروں کی تعداد مختلف ہے۔ کہیں ۱۳ اور کہیں اس سے زیادہ ۱۶ تک ہیں۔ کاغذ یورپ کی ساخت کا باریک ہے۔ متن کی روشنائی سیاہ اور عنوانات سرخ ہیں۔ قلم اول سے آخر تک ایک ہے۔ خط بہت معمولی نستعلیق اور اسقدر اغلاط سے پُر ہے کہ میرزا صاحب کی تصحیح کے باوجود باقی ماندہ غلطیاں اصلاحوں سے زیادہ نظر آتی ہیں۔ ہر نئی غزل کے پہلے مصرعے کے شروع میں سرخ لکیر کھینچی گئی ہے، تا کہ سابق و لاحق میں امتیاز پیدا ہو جائے۔ ۴۸ صفحوں تک کسی نے صفحہ شماری بھی کی ہے۔ عرصۂ دراز

(۱) مکاتیب غالب: ۷۹، ح: ۱۔ (۲) ایضاً: ۸۰ و ۸۱۔

تک «ردی گھر» میں پڑا رہنے کے باوجود اوراق میں بہت معمولی سی کرم خوردگی اور کسی قدر کہنگی پیدا ہوئی ہے۔

صفحات ۶، ۱۲، ۱۴، ۱۷، ۲۲، ۲۶، ۲۷، ۳۱-۳۴، ۳۶-۳۸، ۴۸، ۴۹، ۵۴، ۵۸، ۶۳، ۶۴ پر میرزا صاحب کے قلم کی لفظی اصلاحیں پائی جاتی ہیں، جن میں غلط املے کی تصحیح اور ساقط الفاظ کا اضافہ دونوں شامل ہیں۔

قرائن سے پتا چلتا ہے کہ میرزا صاحب نے مطبعِ نظامی کانپور کے چھپے ہوئے نسخے پر صاد بنا کر کاتب سے شعر نقل کرائے ہیں۔ اس لیے کہ

۱) دہلی اور آگرے کے مطبوعہ نسخوں میں «کیوں کر اُس بت سے رکھوں جان عزیز» والی غزل نہیں ہے۔ مگر نظامی ایڈیشن اور ہمارے انتخاب دونوں میں موجود ہے۔

۲) میرزا صاحب کا یہ شعر:

گدا سمجھ کے وہ چپ تھا مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم میں نے پاسباں کے لیے

میرزا صاحب کی زندگی میں چھپے ہوئے یا لکھے ہوئے تمام نسخوں کے برخلاف صرف نظامی ایڈیشن میں اس طرح کاتب نے مسخ کیا تھا: گدا سمجھ کے وہ چپ تھا، مری خوشامد سے، الخ۔ ہمارے انتخاب میں بھی کاتب نے اس مصرع کو یوں ہی لکھا ہے، جو سوء اتفاق سے میرزا صاحب کی نظرِ تصحیح سے بچ بھی گیا ہے۔

۳) میرزا صاحب کی ایک رباعی کا مصرع دھلی اور آگرے کے ایڈیشنوں میں اس طرح ھے:

یعنی ہر بار کاغذِ باد کی طرح

میرزا صاحب نے دھلوی نسخے کے غلط نامے میں ایک اور مصرع کے اندر لفظ «طرْح» بسکونِ اوسط کے استعمال سے بچنے کی غرض سے اُس مصرع کی تصحیح کی تھی۔ وہ مصرع پہلے یوں تھا: دود کی طرْح رھا سایہ گریزاں مجھہ سے

غلط نامے کے اندر میرزا صاحب نے لکھا:

صورتِ دود رھا سایہ گریزاں مجھہ سے

مگر یہی لفظ مذکورۂ بالا رباعی کے اندر بسکونِ اوسط بندھا تھا، جو غالباً از راہِ سہو غلط نامے میں بھی بار نہ پا سکا۔ نظامی ایڈیشن اور ھمارے انتخاب میں اس کے اندر بھی تغیر کردیا گیا ھے، اور ان دونوں میں یہ مصرع اس طرح تحریر ھوا ھے: یعنی: ہر بار صورتِ کاغذِ باد

٤) میرزا صاحب کی زندگی کے تمام مطبوعہ اور قلمی نسخوں کے برخلاف نظامی ایڈیشن میں چھپا تھا:

بھیجی جو مجھہ کو شاہِ جمجاہ نے دال

ھے لطف و عنایاتِ شہنشاہ پہ دال

انتخاب کے کاتب نے بھی اسی طرح نقل کردیا تھا۔ میرزا صاحب نے تصحیح کرتے وقت دوسرے مصرع میں «عنایات» کی جگہ «عنایت» اپنے قلم سے بنایا ھے۔

ان مواقع کے ماسوا بھی انتخاب کا متن نظامی ایڈیشن کے متن کے مطابق ھے۔

مقدار انتخاب

نظامی ایڈیشن کے ابیات کی مجموعی تعداد ۱۷۹۹ ھے۔ جن میں ۱٤٥۷ شعر غزلوں کے، ۱٦۲ قصائد کے، ۱۱٥ قطعات کے، ۳۲ رباعیوں کے، اور باقی ۲٥ «مثنوی انبہ» کے ھیں۔

انتخاب میں مثنوی مکمل چن لی گئی ھے۔ بقیہ اصناف میں سے غزلوں کے ٦۷۳، قصیدوں کے ۹۲، قطعات کے ٤۰ اور رباعیوں کے ۱۰ شعر انتخاب کیے گئے ھیں، جن کی مجموعی تعداد ۸٤۸ ھوتی ھے۔

فارسی انتخاب

فارسی انتخاب ½۱۱ × ½۷ انچ کے ناپ کے ۸۳ صفحوں پر مشتمل ھے۔ اس کا مسطر ۱۷ سطری ھے، لیکن ھر غزل کے ختم پر دوسری کے عنوان کے خیال سے ایک سطر سادہ چھوڑ دی گئی ھے۔ روشنائی اور کاغذ اردو انتخاب کے جیسا ھے۔ اندازِ تحریر کے معاینے سے معلوم ھوتا ھے کہ تین کاتبوں نے مل کر اسے نقل کیا ھے۔ چنانچہ ص ۱-٤ ایک شخص کا خط ھے۔ اس کے بعد ٥-۹ خود میرزا صاحب کا قلم ھے۔ اور پھر ۱۰-۱٤ پہلے کاتب کا، اور ۱٥ تا آخر تیسرے شخص کا ھے۔

اس حصے کی نقل میں بھی کاتبوں نے غلطیاں کی تھیں، جن میں کی بہت سی میرزا صاحب نے اپنے قلم سے درست کر دی

ہیں[1]. بقیہ میں سے اہم کا ذکر اختلافِ نسخ میں کیا گیا ہے.

غالباً اس انتخاب کی بنیاد کلیاتِ فارسی کے نولکشوری ایڈیشن مطبوعۂ ۱۸۶۳ع پر رکھی گئی ہے، کیونکہ طرزِ کتابت کی یکسانی کے ماسوا، ہمارے انتخاب کی آٹھویں رباعی صرف اسی نسخے میں موجود ہے. البتہ انتخاب کا یہ شعر:

عبودیت نکند اقتضای خواهشِ کام
دعا بصیغۂ امر است و امر بی‌ادبیست

کلیات میں نہیں پایا جاتا. یہ پہلی بار «سبد چین» میں شائع ہوا تھا؛ میرزا صاحب نے اُسی سے مطبوعہ نسخے میں لکھہ لیا ہوگا.

مقدار انتخاب

فارسی کلیات کا انتخاب غزلوں اور رباعیوں تك محدود ہے. مذکورۂ بالا مطبوعہ نسخے میں غزلوں کے اشعار کی تعداد ۳۶۰۶ اور رباعیات کی تعداد ۲۰۸ ہے. ان میں سے ۱۰۶۰ غزلوں کے شعر اور ۱۸ رباعیاں انتخاب کی گئی ہیں. چنانچہ اوپر لکھے ہوئے ایك شعر کو شامل کر لینے کے بعد منتخب اشعار کی مجموعی تعداد ۱۰۹۷ ہوتی ہے.

معیار انتخاب

اس انتخاب کی ترتیب کے وقت، میرزا صاحب کے پیشِ نظر جو معیار تھا، «مکاتیبِ غالب» میں اُس کی تصریح نہیں ملتی؛

(۱) میرزا صاحب کی یہ تصحیحات ص ۳، ۱۶، ۱۷، ۱۹، ۲۴، ۲۶، ۲۸، ۴۳، ۶۱، ۶۴، ۶۸، ۶۹، ۷۴، ۸۳ پر پائی جاتی ہیں.

مگر میرزا صاحب کی دوسری تحریروں کی مدد سے ، شعر و سخن کے متعلق اُن کے عام نقطۂ نگاہ ، اور اُس کی تدریجی ترقی و اصلاح کا تعین ممکن ہے . چونکہ اُن کی آخری عمر کے مذاقِ سخن ھی پر اس انتخاب کے حسن و قبح کا مدار ہے ، اور اُسی کے اجزا کی تعیین سے معیارِ انتخاب کے جزئیات طے کیے جاسکتے ھیں ، اس لیے ضروری ہے کہ پہلے مذکورۂ بالا اردو ، فارسی تحریرون کو مناسب ترتیب کے ساتھ پیش کردیا جائے .

تعریف سخن

شعر و سخن کو میرزا صاحب نے «گران ارز متاعِ عالمِ قدس»[1] قرار دیا ہے ، اور اُس کی ادبی تحدید کی طرف اشارہ کرتے ہوے فرماتے ھیں :

«سخن ایک معشوقۂ پری پیکر ہے . تقطیعِ شعر اُس کا لباس اور مضامین اُس کا زیور ہے . دیدہ وروں نے شاھدِ سخن کو اس لباس اور اس زیور میں روکشِ ماہِ تمام پایا ہے».[2]

اس شاھد کے حسن کی نیرنگی اور اُس کے دیدہ وروں کے ذوق کی بوقلمونی کے متعلق فرماتے ھیں :

«گفتارِ موزون ، که آن را شعر نامند ، در هر دل جائی دیگر ، و در هر دیده رنگی دیگر ، و سخن سرایان را هر زخمه جنبشی دیگر ، و هر ساز آهنگی دیگر دارد».[3]

---

(۱) کلیات نثر : ۳۹۶ . (۲) عود : ۱۸ . (۳) کلیات نثر : ۲۴۲ .

لفظیت و معنویت

«گفتارِ موزوں» کے دو پہلو ہیں: لفظی اور معنوی۔ میرزا صاحب ابتدا میں صرف معنوی پہلو پر زور دیتے تھے، اور لفظی محاسن کی طرف سے بالکل بے توجہ تھے۔ نسخۂ حمیدیہ کے اشعار کے علاوہ، خود ایک خط میں اُنھوں نے اس کی صراحت کردی ہے کہ «شاعری معنی آفرینی ہے»۔[1]

اپنے متعلق اعتراف کرتے ہیں کہ

«نہ آبلہ پای جادۂ صنائعم، و نہ گوهرآمای رشتۂ بدائع۔ کبابِ گرمیء آتشِ بیدودِ پارسیم، و خرابِ تلخیء بادۂ پر زور معنی»۔[2]

میجر جان جاکوب کو بھی یہی لکھا ہے کہ

«سوگند کہ ہیچ گاہ دل بفنِ تاریخ و معما نہ نہادہ ام، و صنعتِ الفاظ را بر معنی نگزیدہ»۔[3]

میرزا تفتہ کو لکھتے ہیں:

«کیا ہنسی آتی ہے، کہ تم مانند اور شاعروں کے مجھ کو بھی یہ سمجھے ہو کہ استاد کی غزل یا قصیدہ سامنے رکھ لیا، یا اُس کے قوافی لکھ لیے اور اُن قافیوں پر لفظ جوڑنے لگے۔ لا حول ولا قوۃ الا باللہ!

بچپن میں جب میں ریختہ کہنے لگا ہوں، لعنت ہے مجھ پر، اگر میں نے کوئی ریختہ یا اُس کے قوافی پیشِ

(۱) خطوط: ۱، ۸۴۔ (۲) کلیات نظم، دیباچہ: ۱۱۔ (۳) کلیات نثر: ۱۷۲۔

نظر رکھہ لیے ہوں ! صرف بحر اور ردیف ، قافیہ دیکھہ
لیا ، اور اُس زمین میں غزل ، قصیدہ لکھنے لگا » .[1]

ایك بار شیونراین کو کسی قدر ترش لہجے میں لکھا ھے :

« بھائی ، حاشا ثم حاشا ! اگر یہ غزل میری ھو :

اسد اور لینے کے دینے پڑے

اُس غریب کو میں کچھہ کیوں کہوں ؟ لیکن اگر یہ
غزل میری ھو ، تو مجھہ پر ھزار لعنت !

اس سے آگے ایك شخص نے یہ مطلع میرے سامنے پڑھا
اور کہا کہ ، قبلہ ! آپ نے کیا خوب مطلع کہا ھے :

اسد ، اس جفا پر بتوں سے وفا کی
مرے شیر، شاباش ، رحمت خدا کی ! ،

میں نے یہی اُن سے کہا کہ اگر یہ مطلع میرا ھو ، تو
مجھہ پر لعنت ! . . .

تم طرزِ تحریر اور روشِ فکر پر بھی نظر نہیں کرتے ؟
میرا کلام اور ایسا مُزخرف ! »[2]

اتفاقاً اُنہیں ایام میں جنون بریلوی نے کسی غزل کی ردیف
اور قافیے کا حوالہ دیکر ، پوری غزل مانگی تھی . اس کے
جواب میں میرزا صاحب نے شیونراین کے نام کے خط کی باتیں
دھرا کر لکھا کہ

« اسد اور شیر ، اور بت اور خدا ، اور جفا اور وفا ، یہ

---

(۱) خطوط : ۱ ، ۸٤ .   (۲) اردو : ۳۷۱ .

میری طرزِ گفتار نہیں ہے »۔[1]

تغیر ذوق

اگرچہ معنویت پسندی کے بیجا توغل نے میرزا صاحب کو عرصے تک بیدل، اسیر اور شوکتِ بخاری کے دام میں پھنسائے رکھا۔ مگر آخرِ کار بیمزہ معنی آفرینی سے خود بھی بچنے لگے، اور شاگردوں کو بھی ھدایت کی کہ نزاکتِ تخییل کو قیدِ لطف سے آزاد نہ ہونے دیا جائے۔ جنون بریلوی کے ایک مطلع کے متعلق لکھتے ھیں:

« اس مطلع میں خیال ہے دقیق، مگر کوہ کندن و کاہ بر آوردن۔ یعنی، لطف زیادہ نہیں »۔[2]

میرزا صاحب کی شاعری کا یہ طلسماتی رنگ اُڑا، تو اُن میں لطفِ زبان سے حظ اندوز ہونے کی صلاحیت بھی ترقی پکڑ گئی، اور اُن کے قلم سے معنی آفرینی کی تعریف و تحسین کے ساتھ ساتھ سلاستِ الفاظ، ندرتِ اسلوبِ ادا، اور دلنشینیء بیان وغیرہ کی داد بھی نکلنے لگی۔ چنانچہ ایک قصیدے کی تعریف میں فرماتے ھیں:

« ھزار آفرین! کیا اچھا قصیدہ ہے۔ واہ، واہ، چشمِ بد دور! تسلسلِ معنی، سلاستِ الفاظ »۔[3]

مہر کے قصیدے کے متعلق زیادہ واضح الفاظ میں لکھتے ھیں:

(۱) اردو: ۲۱۲؛ عود: ۱٦٦۔ (۲) خطوط: ۱، ۱۲۵۔ (۳) ایضاً: ۱، ۷۹۔

« زبان پاکیزہ ، مضامین اچھوتے ، معانی نازک ، مطالب کا بیان دلنشیں ».[1]

شفق کی ایک فارسی غزل کے بارے میں تحریر کیا ھے :

« کیا پاکیزہ زبان ھے ، اور کیا طرزِ بیان ! »[2]

بیخبر کی ایک نئی زمین کی فارسی غزل پڑھ کر لکھا ھے :

« کیا کہنا ھے ! ، ابداع ، اس کو کہتے ھیں . ، جدتِ طرز ، اس کا نام ھے . جو ڈھنگ تازہ نوایانِ ایران کے خیال میں نہ گزرا تھا ، وہ تم بر روی کار لائے ھو ».[3]

مہر کی غزل کے ایک شعر کی داد دیتے ھوے لکھتے ھیں :

« کتنا خوب ھے ، اور اردو کا کیا اچھا اسلوب ھے ! »[4]

نوابِ باندہ کے اشعار پر تبصرہ کرتے ھوے فرماتے ھیں :

« زھی لطفِ طبع ، و حدتِ ذھن ، و سلامتِ فکر ، و حسنِ بیان ».[5]

نساخ کے دیوان پر رائے زنی کرتے ھوے لکھتے ھیں :

« میں دروغگو نہیں . خوشامد میری خو نہیں . دیوانِ فیض عنوان اسم با مسمی ھے . ، دفترِ بیمثال ، اس کا نام بجا ھے . الفاظ متین ، معانی بلند ، مضامین عمدہ ، بندش دلپسند ».[6]

مہر کی مثنوی کے متعلق فرماتے ھیں :

---

(۱) اردو : ۲۶۵ . (۲) ایضاً : ۲۱۳ ، عود : ۵٤ . (۳) اردو : ۲۷۹ ، عود : ۲۷۵ .
(٤) اردو : ۲٦۸ ، عود : ۱۱۱ . (۵) کلیات نثر : ۲۳۲ . (٦) اردو : ۲۰٤ ، عود : ۱۲۵ .

« مثنوی پہنچی . جھوٹ بولنا میرا شعار نہیں . کیا خوب بولچال ہے ! انداز اچھا ، بیان اچھا ، روزمرہ صاف » .[1]

رجب علی بیگ سرور لکھنوی کے ایك شعر کے متعلق لکھتے ھیں :

« رجب علی بیگ سرور نے جو ، فسانۂ عجائب ، لکھا ہے ، آغازِ داستان کا شعر اب مجکو بہت مزا دیتا ہے :

یادگارِ زمانہ ھیں ہم لوگ
یاد رکھنا ، فسانہ ھیں ہم لوگ

مصرعِ ثانی کتنا گرم ہے ، اور ، یاد رکھنا ، فسانے کے ساتھ کتنا مناسب ! »[2]

میزان شعر

مذکورۂ بالا تفصیل کے پیشِ نظر میرزا صاحب نے ایك « میزان » مقرر کی ہے ، اور اُس میں چند اچھے شعروں کو تول کر دکھا دیا ہے . لکھتے ھیں :

« اس رقعے میں ایك میزان عرض کرتا ھوں . حضرت صاحب اُن صاحبوں کے کلام کو ، یعنی ، ھندیوں کے اشعار کو ، قتیل اور واقف سے بیدل اور ناصر علی تك اس میزان میں تولیں . میزان یہ ہے :

رودکی و فردوسی سے لیکر خاقانی و سنائی و انوری

(۱) اردو : ۲۵۰ ، عود : ۱۱۷ . (۲) اردو : ۱۰۵ .

وغیرہم تک ایک گروہ۔ ان حضرات کا کلام تھوڑے تھوڑے تفاوت سے ایک وضع پر ہے۔

پھر حضرتِ سعدی طرزِ خاص کے موجد ہوئے۔ سعدی و جامی و ہلالی یہ اشخاص متعدد نہیں۔

فغانی ایک اور شیوۂ خاص کا مبدع ہوا۔ خیالہای نازک و معانیء بلند لایا۔ اس شیوے کی تکمیل کی ظہوری و نظیری و عرفی و نوعی نے۔ سبحان اللہ! قالبِ سخن میں جان پڑ گئی۔

اس روش کو بعد اس کے صاحبانِ طبع نے سلاست کا چربا دیا۔ صائب و کلیم و سلیم و قدسی و حکیم شفائی اس زمرے میں ہیں۔

رودکی و اسدی و فردوسی، یہ شیوہ سعدی کے وقت میں ترک ہوا۔ اور سعدی کی طرز نے بسبب سہلِ ممتنع ہونے کے رواج نہ پایا۔ فغانی کا انداز پھیلا اور اُس میں نئے نئے رنگ پیدا ہوتے گئے۔

تو اب طرزیں تین ٹھہریں:

(۱) خاقانی، اُس کے اقران، (۲) ظہوری، اُس کے امثال، (۳) صائب، اُس کے نظائر۔

خالصاً للہ! ممتاز و اختر وغیرہم کا کلام، ان تین طرزوں میں سے کس طرز پر ہے؟ بے شبہہ فرماؤ گے کہ یہ طرز اور ہی ہے۔ بس تو ہم نے جانا کہ یہ طرز چوتھی ہے۔

اب

کیا کہنا ھے! خوب طرز ھے، اچھی طرز ھے، مگر فارسی نہیں ھے، ھندی ھے. دارالضرب شاھی کا سکہ نہیں ھے، ٹکسال باھر ھے. داد، داد! انصاف، انصاف!

اگرچه شاعرانِ نغز گفتار
ز یك جام اند در بزمِ سخن مست
ولی با بادهٔ بعضی حریفان
خمارِ چشمِ ساقی نیز پیوست
مشو منکر که در اشعارِ این قوم
ورای شاعری، «چیزی دگر» هست

وہ «چیزِ دگر» حصے میں پارسیوں کے آئی ھے. ھاں، اردو زبان میں اھلِ ھند نے وہ چیز پائی ھے:

میر تقی علیه الرحمه: بدنام ھوگے، جانے بھی دو امتحان کو
رکھے گا کون تم سے عزیز اپنی جان کو؟

سودا: دکھلائیے لیجا کے تجھے مصر کا بازار
خواھاں نہیں، لیکن، کوئی واں جنسِ گراں کا

قائم: قائم اور تجھ سے طلب بوسے کی، کیونکر مانوں
ھے تو ناداں، مگر اتنا بھی بدآموز نہیں

مومن خاں: تم مرے پاس ھوتے ھو، گویا
جب کوئی دوسرا نہیں ھوتا

ناسخ کے ھاں کمتر اور آتش کے ھاں بیشتر یہ تیر و نشتر ھیں. مگر مجھے اُن کا کوئی شعر اس وقت یاد

نہیں آتا».[1]

خلاصۂ بحث

خلاصه یه هے که میرزا صاحب کے نزدیك اچھے شعروں میں، لفظاً، سلاست و متانتِ الفاظ، پاکیزگی و صفائیء روزمره، ندرت و دلپسندیء بندش اور حسنِ بیان؛ اور معنًی، بلندیء خیال، نزاکتِ معنی، عمدگیء مضمون، اور سلاست و تازگیء فکر هونا چاهیے. اسی کا نام شیوا بیانی هے، اور یهی خوبیاں کلام کو «سهلِ ممتنع» بناتی هیں. ایك خط میں فرماتے هیں:

> «خود ستائی هوتی هے. سخن فهم اگر غور کریگا، تو فقیر کی نظم و نثر میں سهلِ ممتنع اکثر پائےگا».[2]

انتخاب پر غور کرنے سے اندازه هوتا هے که بڑی حد تك انهیں صفاتِ لفظی و معنوی کو میرزا صاحب نے معیارِ انتخاب قرار دیا هے. چنانچه وه تمام فارسی و اردو اشعار، جن میں بیمزه تخییل کارفرما تھی، یا بےلطف اور دور از کار تشبیهیں اور استعارے استعمال هوئے تھے، یا غیر مانوس فارسی ترکیبیں جلوه گر تھیں، انتخاب میں شامل نهیں کیے گئے هیں. اسی طرح وه شعر بھی شاملِ انتخاب نهیں هو سکے هیں، جن میں اگرچه کوئی عیب تو نهیں پایا جاتا، لیکن اُسی غزل کے دوسرے

---

(۱) اردو: ۱٤۹، ۱۵۰؛ عود: ٤۵، ٤٦. شفق کو اختصاراً صرف دو روشیں بتائی هیں: متقدمین، یعنی، امیر خسرو اور سعدی اور جامی کی روش، اور متأخرین، یعنی، صائب و کلیم و قدسی کا انداز. ملاحظه هو اردو: ۳۱۵؛ عود: ۵۱.

(۲) عود: ۱٤۰.

اشعار کے مقابلے میں اُن کا درجۂ حسن و خوبی پست تر ھے۔
صنفِ اول کی مثال میں دیوانِ قدیم کی متروکہ غزلوں کے علاوہ حسبِ ذیل اشعار بھی پیش کیے جا سکتے ھیں:

۱ شمارِ سُبحہ مرغوبِ بتِ مشکل پسند آیا
تماشای بیک کف بردنِ صد دل پسند آیا

۲ نقشِ نازِ بتِ طنّاز بآغوشِ رقیب
پای طاؤس پیء خامۂ مانی مانگے

صنفِ دوم کی تمثیل میں یہ شعر کام آ سکتے ھیں:

۱ سب، کو مقبول ھے دعوے تری یکتائی کا
رو برو کوئی بتِ آئینہ سیما نہوا

۲ موت کی راہ نہ دیکھوں کہ بن آئے نہ رھے
تم کو چاھوں کہ نہ آؤ، تو بُلائے نہ بنے

لیکن دیوانِ اردو اور فارسی میں بہت سے ایسے شعر بھی نظر آتے ھیں، جو اپنی خوبیوں کے باعث ھر طرح مستحقِ انتخاب تھے۔ مثلاً:

۱ حالِ ما از غیر می پرسی و منت میبریم
آگہی، باری، کہ آگہ نیستی از حالِ ما

۲ مرنج از ناروائی، بی نیازی عالمی دارد
حکایتہا بود از خویشتن مر میزبانان را

۳ خوشست افسانۂ دردِ جدائی مختصر، غالب
بمحشر میتوان گفت، آنچہ در دل ماندہ است امشب

٤ رندِ هزار شیوه را طاعتِ حق گران نبود
لیك صنم بسجده در، ناصیه مشترك نخواست

٥ گر منافق، وصل ناخوش؛ ور موافق، هجر تلخ
دیده داغم کرد؛ روی دوستان دیدن نداشت

٦ زیستم بی تو و زین ننگ نه کشتم خود را
جان فدای تو! میا، کز تو حیا می آید

٧ مقصودِ ما ز دیر و حرم، جز حبیب نیست
هرجا کنیم سجده، بدان آستان رسد

٨ گفتم: «گره ز کارِ دل و دیده باز کن»
از جبهه ناکشوده، به بندِ نقاب بُرد

٩ اگر بدل نخلد، هرچه از نظر گزرد
زهی روانیء عمری که در سفر گزرد!

١٠ حریفِ منتِ احباب نیستم، غالب
خوشم، که کارِ من از سعی چاره‌گر گزرد

١١ می بزهاد مکن عرض، که این جوهرِ ناب
پیشِ این قوم، بشورابهٔ زمزم نرسد

١٢ بیاورید، گر اینجا بود زباندانی
غریبِ شهر سخنهای گفتنی دارد

١٣ شوق گستاخ و تو سرمست، بدا رسوائی!
هان، ادائی که دل و دستِ من از کار برد

١٤ رو، تن به بلا ده، که دگر بیمِ بلا نیست
مرغِ قفسی کشمکشِ دام ندارد

١٥ اگر نه مایلِ بوسِ لبِ خودست، چرا
بلب، چو تشنه، دمادم زبان بگرداند؟

١٦ ذوقیست همدمی به فغان، بگرزم ز رشك
خارِ رهت بپای عزیزانِ خلیده باد!

١٧ سرمایۂ خرد بجنون ده، که این کریم
یك سود را هزار زیان میدهد عوض

١٨ تا باده تلخ تر شود و سینه ریشتر
بگدازم آبگینه و در ساغر افگنم

١٩ بجنگ، باج ستانانِ شاخساری را
تهی سبد، ز درِ گلستان بگردانیم

٢٠ به صلح، بالفشانانِ صبحگاهی را
ز شاخسار، سوی آستان بگردانیم

---

٢١ وای دیوانگیء شوق! که هردم مجکو
آپ جانا اُدهر، اور آپ هی حیراں هونا

٢٢ بجلی اك کوند گئی آنکهوں کے آگے، تو کیا؟
بات کرتے که میں لب تشنۂ تقریر بهی تها

٢٣ گو میں رها رهینِ ستمهای روزگار
لیکن ترے خیال سے غافل نہیں رها

٢٤ غمِ هستی کا، اسدؔ، کس سے ہو، جز مرگ، علاج؟
شمع ہر رنگ میں جلتی ہے سحر ہوتے تک

٢٥ تھی وہ اك شخص کے تصور سے
اب وہ رعنائیء خیال کہاں

٢٦ جب کرم رخصتِ بیباکی و گستاخی دے
کوئی تقصیر، بجز خجلتِ تقصیر، نہیں

٢٧ کبھی جو یاد بھی آتا ہوں میں، تو کہتے ہیں
کہ «آج بزم میں کچھ فتنہ و فساد نہیں»!

٢٨ جانفزا ہے بادہ، جس کے ہاتھ میں جام آ گیا
سب لکیریں ہاتھ کی، گویا رگِ جاں ہو گئیں

٢٩ ہاں، وہ نہیں خدا پرست؛ جاؤ، وہ بیوفا سہی
جسکو ہوں دین و دل عزیز، اُسکی گلی میں جائے کیوں؟

٣٠ قفس میں مجھ سے رودادِ چمن کہتے نہ ڈر، ہمدم
گری ہے جس پہ کل بجلی، وہ میرا آشیاں کیوں ہو؟

٣١ یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہے؟
ہوئے تم دوست جس کے دشمن اُس کا آسماں کیوں ہو؟

٣٢ کہا تم نے کہ «کیوں ہو غیر کے ملنے میں رسوائی؟»
بجا کہتے ہو، سچ کہتے ہو، پھر کہیو کہ «ہاں، کیوں ہو؟»

٣٣ رہیے اب ایسی جگہ چل کر، جہاں کوئی نہو
ہم سخن کوئی نہو، اور ہمزباں کوئی نہو

۳۴ بے در و دیوار سا اک گھر بنایا چاہیے
کوئی ہمسایہ نہو، اور پاسباں کوئی نہو

۳۵ پڑیے گر بیمار، تو کوئی نہو تیماردار
اور اگر مر جائیے، تو نوحہ خواں کوئی نہو

---

۳۶ مرے دل میں ہے، غالب، شوقِ وصل و شکوۂ ہجراں
خدا وہ دن کرے، جب اُس سے میں یہ بھی کہوں، وہ بھی!

---

۳۷ بس، ہجومِ نا امیدی، خاک میں ملجائیگی
وہ جو اک لذت ہماری سعی بیحاصل میں ہے

---

۳۸ ہر بُلہوس نے حسن پرستی شعار کی
اب آبروی شیوۂ اہلِ نظر گئی

---

۳۹ جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد
پر طبیعت ادھر نہیں آتی

---

۴۰ عشق پر زور نہیں؛ ہے یہ وہ آتش، غالب
کہ لگائے نہ لگے، اور بجھائے نہ بنے

---

۴۱ جی ڈھونڈھتا ہے پھر وہی فرصت کہ رات دن
بیٹھے رہیں تصورِ جاناں کیے ہوے

---

۴۲ زباں پہ، بارِ خدایا! یہ کس کا نام آیا؟
کہ میرے نطق نے بوسے مری زباں کے لیے

ان جیسے شعروں کو نظر انداز کر دینے کی وجہ یہ معلوم ہوتی ہے کہ میرزا صاحب نے یہ انتخاب چند روز کے اندر مرتب

کیا تھا. عجلت میں یوں بھی ذہن کی تمام قوتیں کامل اشتراک و ہم آہنگی سے کام نہیں کرسکتیں. میرزا صاحب کے یہاں اس پر مستزاد یہ تھا کہ آئے دن کی بیماریوں سے اُن کے قوای ظاہر و باطن بیحد کمزور و ناتواں ہو گئے تھے. تنگدستی اور پریشان روزگاری نے طرح طرح کی دماغی اُلجھنوں میں الگ گرفتار کر دیا تھا. اب اُنہیں شعر و سخن کی جگہ کافور و کفن کی پڑی رہتی تھی، اور صرف موت کی آس پر جی رہے تھے. ان حالات میں مستبعد نہیں کہ اچھے بُرے میں فرق و تمیز کرتے وقت اُن سے اچھے شعر نظرانداز ہو گئے ہوں، اور دو چار معمولی اشعار کو کسی وقتی جذبے کے ماتحت چُن لیا ہو.

بہرحال، یہ انتخاب بیحد قابلِ قدر، اور غالب سے متعلق ادب میں ایسا نایاب اضافہ ہے، جس کی قدر و قیمت میں برابر ترقی ہوتی رہیگی.

خدا کرے، بندگانِ ہمایونِ اعلیٰ حضرت، دام اقبالہم وملکہم، کی بارگاہ میں اس کو شرفِ قبول عطا ہو! آمین!

احقر
امتیاز علی عرشی

یہ کتاب عبد الصمد شرف الدین نے شرف الدین [illegible] کے مطبعۂ قیمہ، واقع نمبر ۲۹ شارع محمد علی، بمبئی نمبر ۳، میں طبع کی؛ اور کتابخانۂ [illegible] رامپور، یو پی، میں شائع ہوئی

انتخاب غالب

فارسی

چند رنگین نکتهٔ دلکش : تکلّف برطرف !

دیده‌ام دیوانِ غالب : انتخابی بیش نیست !!



غزلیّات

الف

ای بخلا و ملا خوی تو هنگامه زا !!
با همه در گفتگو ، بی همه با « ما جرا »

شاهدِ حسنِ ترا ، در روشِ دلبری
طرّهٔ پرخم صفات ، موی میان « ما سوا »

خلد به غالب سپار؛ زانکه بدان روضه در
نیک بود عندلیب خاصه نو آئین نوا

۲

خویِ شرمِ گنه، در پیشگاهِ رحمتِ عامت
سهیل و زهره افشاند ز سیما روسیاهان را

بدلها ریختی یکسر شکستن هم ز یزدان دان
که لختی بر خمِ زلف و کله زد کجکلاهان را

۳

خاموشیِ ما گشت بدآموز بتان را
زین پیش، وگرنه، اثری بود فغان را

موئی که برون نامده باشد، چه نماید؟
بیهوده، در اندامِ تو جستیم میان را

بر طاعتیان فرّخ و بر عشرتیان سهل!
نازم شبِ آدینهٔ ماهِ رمضان را!

ای خاکِ درت قبلهٔ جان و دلِ غالب!
کز فیضِ تو، پیرایهٔ هستیست جهان را

تا نامِ تو، شیرینیء جان داده بگفتن
در خویش فرو برده دل، از مهر، زبان را

بر امّتِ تو، دوزخِ جاوید حرامست
حاشا که شفاعت نکنی سوختگان را!



ما همای گرم پروازیم، فیض از ما مجوی
سایه، همچون دود، بالا میرود از بالِ ما

جانِ غالب! تابِ گفتاری گمان داری هنوز؟
سخت بیدردی که می پرسی ز ما احوالِ ما!



گر بیائی مست ناگاه، از درِ گلزارِ ما
گل، ز بالیدن، رسد تا گوشهٔ دستارِ ما

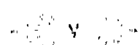
چاكِ «لا» اندر گریبانِ جهات افگنده‌ایم
بی جهت بیرون خرام، از پردهٔ پندارِ ما

ذرّه، جز در روزنِ دیوار، نکشودست بار
جنسِ بیستانی بدزدی برده، از بازارِ ما

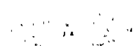


من و ذوقِ تماشای کسی، کز تابِ رخسارش
جگر بر تابه چسپد، آفتابِ عالم آرا را!

دلِ مایوس را، تسکین به مردن میتوان دادن
چه امیدست، آخر، خضر و ادریس و مسیحا را!



بپایش جان فشاندن شرمسارم کرد، میدانم
که داند: ارزشی نبود متاعِ رایگان را



محو کن نقشِ دوئی از ورقِ سینهٔ ما
ای نگاهت الفِ صیقلِ آئینهٔ ما!!

عرصه بر الفتِ اغیار چه تنگ آمده است !
خوش فرورفته بطبعِ تو ، خوشا کینهٔ ما !!

۹

سوزِ عشقِ تو ، پس از مرگ ، عِیانست مرا
رشتهٔ شمعِ مزار ، از رگِ جانست مرا

دل خود از تست و هم از ذوقِ خریداری، تست
این همه بحث که در سود و زیانست مرا

چون پریزاد که در شیشه فرودش آرند
روی خوبت ، بدل از دیده نهانست مرا

۱۰

بی‌تو، چون باده که در شیشه هم از شیشه جداست
نَبْوَد آمیزشِ جان ، در تنِ ما ، با تنِ ما

تا نَرَود شکوهٔ تیغِ ستم آسان از دل
بخیه ، بر زخم پریشان فند ، از سوزنِ ما

می‌پرد مور؛ مگر جان بسلامت ببَرد
تا چه برقست که شد نامزدِ خرمنِ ما!

ما نبودیم بدین مرتبه راضی، غالب
شعر خود خواهشِ آن کرد که گردد فنِ ما!

۱۱

با بندهٔ خود، این همه سختی نمی‌کنند
خود را، بزور بر تو، مگر، بسته‌ایم ما؟

سوزِ ترا، روان همه در خویشتن گرفت
از داغ، تهمتی به جگر بسته‌ایم ما

گوئی: «وفا ندارد اثر»، هم بما گرای
زین سادگی، که دل به اثر بسته‌ایم ما

۱۲

در گردِ غربت، آئینه دارِ خودیم ما
یعنی ز بیکسانِ دیارِ خودیم ما

با چون توئی معامله، بر خویش منّتست
از شکوهٔ تو، شکرگزارِ خودیم ما

غالب، چو شخص و عکس، در آئینهٔ خیال
با خویشتن یکی و دوچارِ خودیم ما

۱۳

بروی برگِ گل، تا قطرهٔ شبنم نه پنداری
بهار، از حسرتِ فرصت، بدندان میگزد لبها

کند گر فکرِ تعمیرِ خرابیهای ما، گردون
نیاید خشت، مثلِ استخوان، بیرون ز قالبها

۱٤

پس از عمری که فرسودم بمشقِ پارسائیها
گدا گفت و بمن تن در نداد، از خود نمائیها

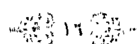
نیرزم التفاتِ دزد و رهزن؛ بی نیازی بین:
متاعم را بغارت داده اند، از ناروائیها



جان بر نتابد، ای دل! هنگامهٔ ستم را
از سینه ریز بیرون، مانندِ تیغ، دم را

بیوجه در رهت نیست، از پا فتادنِ من
بر دیده می‌نشانم، در هر قدم، قدم را

مانندِ خارزاری کاتش زنند در وی
سوزد، ز بیمِ خویت، اجزای ناله هم را



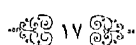
من آن نیم که دگر میتوان فریفت مرا
فریبمش که مگر میتوان فریفت مرا

بحرفِ ذوقِ نگه، میتوان ربود مرا
بوهمِ تابِ کمر، میتوان فریفت مرا

من و فریفتگی، هرگز آن محال اندیش
چرا فریفت، اگر میتوان فریفت مرا؟

ز باز نامدنِ نامه‌بر خوشم که هنوز
به آرزوی خبر، میتوان فریفت مرا

شبِ فراق ندارد سحر؛ ولی یك چند
بگفتگوی سحر، میتوان فریفت مرا



ز من گرت نبُوَد باور انتظار، بیا
بهانه جوی مباش و ستیزه کار بیا

بیك دو شیوه ستم، دل نمی‌شود خرسند
بمرگِ من! که بسامانِ روزگار بیا

بهانه جوست در الزامِ مدعی، شوقت
یکی، برغمِ دلِ نا امیدوار، بیا!

هلاكِ شیوهٔ تمکین مخواه مستان را
عنان گسسته تر از بادِ نوبهار، بیا!

وَداع و وصل جداگانه لذتی دارد
هزار بار برو، صد هزار بار بیا!



چون بقاصد بِسپرم پیغام را
رشك نگزارد که گویم نام را

گشته در تاریکیء روزم نهان
کو چراغی، تا بجویم شام را؟

آن مَیَم باید که چون ریزم بجام
زورِ می در گردش آرد جام را

تا نیفتد هرکه تن پرور بود
خوش بود، گر دانه نبود دام را!

زحمتی عامست دائم خاص را
عشرتی خاصست مردم عام را

۱۹

در هجر، طرب بیش کند تاب و تبم را
مهتاب، کفِ مارِ سیاهست، شبم را

ترسم که دهد ناله جگر را بدریدن
قطعِ نظر از جیب، بدوزید لبم را

۲۰

برنمی‌آید ز چشم، از جوشِ حیرانی مرا
شد نگه زنّارِ تسبیحِ سلیمانی مرا

وه! که پیش از من بپابوسِ کسی خواهد رسید
سجدهٔ شوقی، که می بالد به پیشانی مرا

همچنین بیگانه زی با من، دل و جانِ کسی!
بدگمان گردم، اگر دانم که میدانی مرا

تشنه‌لب بر ساحلِ دریا ز غیرت جان دهم
گر بموج افتد گمانِ چینِ پیشانی، مرا

۲۱

از وهمِ قطرگیست که در خود گمیم ما
اما چو وا رسیم، همان قازمیم ما

مردم، بکینه، تشنهٔ خونِ همند و بس
خون می‌خوریم، چون هم ازین مردمیم ما

۲۲

به بیم افگنده می را، چارهٔ رنجِ خمارِ ما
قدح بر خویش می‌لرزد، ز دستِ رعشه دارِ ما

فروزد هر قدر رنگِ گل، افزاید تب و تابش
کبابِ آتشِ خویشست، پنداری، بهارِ ما

۲۳

بپایانِ محبت، یاد می‌آرم زمانی را
که دل، عهدِ وفا نابسته، دادم دلستانی را

ندارم تابِ ضبطِ راز و می‌ترسم ز رسوائی
مگر جویم، ز بهرِ همزبانی، بیزبانی را

بشهر از دوست، بعد از روزگاری، یافتم، غالب
ز عنوانِ خطی، کز راهِ دور آمد، نشانی را

۲۴

از تست اگر ساخته، پرداختهٔ ما
کفری نبود مطلبِ بیساختهٔ ما

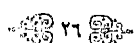
وقتست که چون گرد، ز تحریکِ نسیمی
ریزد پر و بال از قفسِ فاختهٔ ما

۲۵

خوش وقتِ اسیری! که برآمد هوسِ ما
شد، روزِ نخستین، سبدِ گل قفسِ ما

آوازهٔ شرع از سرِ منصور بلندست
از شبرَویِ ماست، شکوهِ عسسِ ما

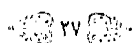
در دهر، فرو رفتهٔ لذّت نتوان بود
بر قند، نه بر شهد، نشیند مگسِ ما


۲۶

ز پیکانهای ناوك ، در دلِ گرمم نشان نبود
بریگستان چه جوئی ، قطره‌های آبِ باران را؟

کفِ خاکیم ؛ از ما برنخیزد جز غبار آنجا
فزون از صرصری نبود قیامت ، خاکساران را

درآ بیخود ببازیگاهِ اهلِ حسن ؛ تا بینی ،
بروی شعله ، گرمِ مشقِ جولان ، نی سواران را


۲۷

ز پیدائی ، حجابِ جلوه سامان کردنش نازم !
کفِ صهباست ، گوئی ، پنبه مینای شرابش را

دمِ صبحِ بهار ، این مایه مدهوشی نمی‌ارزد
صبا بر مغزِ دهر افشانده ، گوئی ، رختِ خوابش را

ز خوبان جلوه ، وز ما بیخودان جان ، رونما خواهد
خریدارست ، ز انجم تا به شبنم ، آفتابش را

۲۸

مدام محرمِ صهبا بود، پیالهٔ ما
بگردِ مهر، تنیدست خطِّ هالهٔ ما

چمن طرازِ جنونیم و دشت و کوه از ماست
به مُهرِ داغِ شقایق بود قَبالهٔ ما

درازیء شبِ هجران ز حد گزشت، بیا
فدای روی تو عمرِ هزارسالهٔ ما!

ز سعیِ هرزه، به بیحاصلی علم گشتیم
چو باد، بید پدید آمد، از امالهٔ ما

بدل، ز جورِ تو، دندان فشرده ایم و خوشیم
ز استخوان اثری نیست در نوالهٔ ما

۲۹

کدام آئینه با روی او مقابل شد
که بیقراریء جوهر نبرد زنگش را؟

چو غنچه ، جوشِ صفای تنش ، ز بالیدن
درید بر تنِ نازك قبای تنگش را

جگر نشانه نهم ، بر خود اعتمادم نیست
مباد ! دل ، به تپش ، رد کند خدنگش را

۳۰

زین بهارآئین نگاهان ، بُو که بپزیرد یکی
عمرها شد ، رخ بخونِ دیده می‌شوئیم ما !

آفتابِ عالمِ سرگشتگیهای خودیم
تا بزانو سوده پای ما و می‌پوئیم ما

۳۱

داغم که در هوای سرِ دامنِ کسیست !
در خونِ من ، ز ناز ، فرو برده چنگ را

در بزم ، می بجامِ زمرد نخوردهٔ :
سنجد بدشت جلوهٔ داغِ پلنگ را

در گوشهٔ خزیده ، ز اندوهِ بیکسی
آن برشکسته خلوتِ دلهای تنگ را

غالب ، ز عاشقی به ندیمی رسیده ام
نازم شگرفکاریِ بختِ دو رنگ را !

۳۲

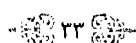
سوزد ، ز بسکه ، تابِ جمالش نقاب را
دانم که درمیان نه پسندد حجاب را

پیراهن از کتان و ، دمادم ، ز سادگی
نفرین کند ، به پرده دری ، ماهتاب را

نازم فروغِ باده ز عکسِ جمالِ دوست !
گوئی ، فشرده اند بجام آفتاب را

آبش دهم به باده و او هردم ، از تمیز
نوشد می و ز جام فرو ریزد آب را

تا خود شبی به همدمیء ما بسر برد
در چشمِ بختِ غیر، رها کرد خواب را

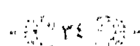


چنان گرمست بزم از جلوهٔ ساقی، که پنداری،
گدازِ جوهرِ نظّاره در جامست، مستان را

تکلف برطرف، لب تشنهٔ بوس و کنارستم
ز راهم باز چین، دامِ نوازشهای پنهان را

باندازِ صبوحی، چون بگلشن ترکتاز آری،
پریدنهای رنگِ گل شفق گردد گلستان را

رسیدنهای منقارِ هما بر استخوان، غالب
پس ازعمری، بیادم داد رسم و راهِ پیکان را



بخلوت، مژدهٔ نزدیکیء یارست پهلو را
فریبِ امتحانِ پاکبازی داده‌ام او را

جهان، از باده و شاهد، بدان ماند که، پنداری،
بدنیا از پسِ آدم فرستادند مینو را

نباشد دیده تا حق بین، مده دستوریِ اشکش
چو گوهر سنج، کو پیش از گهر سنجد ترازو را

۳۵

بسکه غمِ تو بوده است تعبیه در سرشتِ ما
نسخهٔ فتنه می برد، چرخ ز سرنوشتِ ما

برده صد اربعین بسر، بر سرِ صد هزار خم
گر بنهی در آفتاب، باده چکد ز خشتِ ما

باده اگر بود حرام، بذله خلافِ شرع نیست
دل ننهی بخوبِ ما، طعنه مزن بزشتِ ما

۳۶

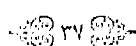
دل تابِ ضبطِ ناله ندارد؛ خدای را!
از ما مجوی گریهٔ بی های های را

سرمنزلِ رسائیء اندیشهٔ خودیم
در ما گسست جلوه پیء رهنمای را

حسنِ بتان، ز جلوهٔ نازِ تو، رنگ داشت
بیخود، به بوی باده، کشیدیم لای را

یا رب! ببالِ تیغ که پرواز می‌کند؟
نگسست دوش، فرقِ بلندی‌گرای را

مُردم ز فرطِ ذوق و تسلّی نمی‌شوم
یا رب! کجا برم لبِ خنجرستای را؟


۳۷

تا دوخت چاره‌گر جگرِ چارپاره را
از بخیه، خنده بر دمِ تیغست چاره را

سرگرمِ مهر شد دلِ چرخِ ستیزه‌خو
چندان که داغ کرد جبینِ ستاره را

ای لذتِ جفای تو، در خاك بعدِ مرگ،
با جان سرشته، حسرتِ عمرِ دوباره را!

۳۸

طبیعی نیست هرجا اختلاط، ازوی حذر خوشتر
کم از سوزنده آتش نیست، آبِ گرم ماهی را

دلا! گر داوری داری بچشمِ سرمه آلودش
نخستم بی‌زبان کن، تا بکار آیم گواهی را

مرو در خشم، گر دستی بدامانِ تو زد غالب
وکیلش من، نمی‌داند طریقِ دادخواهی را

۳۹

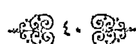
لرزه دارد خطر، از هیبتِ ویرانهٔ ما
سیل را، پای بسنگ آمده، در خانهٔ ما

تفی از برقِ بلا تعبیه دارد در خویش
دهنِ خاك کند آبله، از دانهٔ ما

بچراغی نرسیدیم ، درین تیره سرا
شمعِ خاموش بود ، طالعِ پروانهٔ ما

مو برآید ز کفِ دست ، اگر ، دهقان را
نیست ممکن که کشد ریشه سر از دانهٔ ما

داده بر تشنگیِ خویش گواهی ، غالب
دهنِ ما ، بزبانِ خطِ پیمانهٔ ما



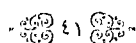
ای گل از نقشِ کفِ پای تو دامانِ ترا !
گلفشان کرد ، قبا ، سروِ خرامانِ ترا

تا ز خونِ که ازین پرده شفق باز دمد ؟
رونقِ صبحِ بهارست گریبانِ ترا

هر قدر شکوه ، که در حوصله گرد آمده بود ،
گوی گردید ، به مستی ، خمِ چوگانِ ترا

چشمم آغشته بخون بین و ز خلوت بدر آی
اینک ! ابرِ شفق آلوده گلستانِ ترا

چه غم ، ار سیلیِ سنگِ ستمش کرد کبود !
سبزه زاریست تنم طرفِ خیابانِ ترا



غمت در بوتهٔ دانش گدازد مغزِ خامان را
لبت تنگِ شکر سازد دهانِ تلخ کامان را

ز هستی پاك شو ، گر مردِ راهی ؛ کاندرین وادی
گرانیهاست ، رختِ رهروِ آلوده دامان را

بسا افتاده سرمست و بسا خم گشته در طاعت
تو دانی ، تا به لطف از خاك برداری کدامان را

جهان را خاصی و عامیست : آن مغرور و این عاجز
بیا ، غالب ، ز خاصان بگزر و بگزار عامان را



۴۲

نگویم ، تازه دارم شیوهٔ جادو بیانان را
ولی در خویش بینم کارگر، جادوی آنان را

ندارد حاجتِ لعل و گهر ، حسنِ خداداد
عبث در آب و آتش راندهٔ بازارگانان را

به لفظِ عشق ، صد ره کوه و دریا درمیان گفتن
بیاموزید ، تا پیشش برید افسانه خوانان را

نگیرد دیگران را حق ، بجرمی کز یکی بخشد
سرت گردم ! شفیعی روزِ محشر دلستانان را

نداند قدرِ غم ، تا درنماند کس بدان ، غالب
مسرت خیزد ، از تقلیدِ پیران ، نوجوانان را

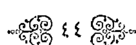
ب

عالم آئینهٔ رازست ، چه پیدا ، چه نهان
تابِ اندیشه نداری ، به نگاهی دریاب

گر بمعنی نرسی ، جلوهٔ صورت چه کمست ؟
خمِ زلف و شکنِ طرفِ کلاهی دریاب

تو در آغوشی و دست و دلم از کار شده
تشـــنه ، بی دلو و رسن ، بر سرِ چاهی دریاب

غالب و کشمکشِ بیم و امیـــدش ، هیهات !
یا به تیغی بکُش و یا به نگاهی دریاب



گر ، پس از جور ، بانصاف گراید ، چه عجب ؟
از حیا روی بما گر نه نماید ، چه عجب ؟

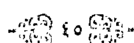
بودش از شکوه خطر ؛ ورنه سری داشت بمن
بمزارم ، اگر ، از مهر بیـاید ، چه عجب ؟

رسمِ پیمان بمیان آمـده ؛ خود را نازم !
گفته باشد که « ز بستن چه کشاید » ، چه عجب ؟

کار با مطربهٔ زهره نهادی دارم
گر لبم ناله بهنجار سراید، چه عجب؟

آن که چون برق بیك جای نگیرد آرام
گله‌اش در دل اگر دیر نپاید، چه عجب؟

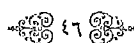
با چنین شرم که از هستیء خویشش باشد
غالب ار رخ برهِ دوست نساید، چه عجب؟



جنون محمل بصحرای تحیّر رانده است امشب
نگه در چشم و آهم در جگر وامانده است امشب

زهی آسایشِ جاوید! همچون صورتِ دیبا
نم زخمم تن و بستر بهم چسپانده است امشب

بقدرِ شامِ هجرانش، درازی باد عمرش را!
فلك نیز از کواکب سُبحه ها گردانده است امشب



هان ! آئنه بگزار که عکسم نفریبد
نظارهٔ یکتائیء حق میکنم امشب

آتش بنهادم شده آب ، از تفِ مغزم
از تب نبود ، این که عرق میکنم امشب

نازم سخنش را و نیابم دهنش را
خوش تفرقه در باطل و حق میکنم امشب

پ

تو محوِ خواب ، و سحر در تاسف ، از انجم
به پشتِ دست بدندان گزیدنست ، مخسپ

نفس ، ز ناله ، به سنبل درودنست ، بخیز
ز خونِ دل ، مژه در لاله چیدنست ، مخسپ

نشاطِ گوش بر آوازِ قلقل است ، بیا
پیاله چشم براهِ کشیدنست ، مخسپ

نشانِ زندگیِ دل دویدنست ، مَایست
جلای آئنهٔ چشم دیدنست ، مخسپ

ز دیده ، سودِ حریفان کشودنست ، مبند
ز دل ، مرادِ عزیزان تپیدنست ، مخسپ

بذکرِ مرگ شبی زنده داشتن ذوقیست
گرت فسانهٔ غالب شنیدنست ، مخسپ

ت

حق جلوه گر ز طرزِ بیانِ محمدست
آری ، کلامِ حق بزبانِ محمدست

آئینه دارِ پرتوِ مهرست ، ماهتاب
شانِ حق آشکار ز شانِ محمدست

تیرِ قضا ، هرآئنه ، در ترکشِ حقست
اما کُشادِ آن ز کمانِ محمدست

دانی، اگر بمعنیء «لولاك» وا رسی:
خود هرچه از حق است، ازانِ محمدست

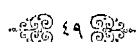
هر کس قسم، بدانچه عزیزست، میخورد
سوگندِ کردگار بجانِ محمدست

واعظ، حدیثِ سایهٔ طوبیٰ فروگزار؛
کاینجا سخن ز سروِ روانِ محمدست

بنگر دو نیمه گشتنِ ماهِ تمام را
کان نیمه جنبشی ز بَنانِ محمدست

ور خود ز نقشِ مهرِ نبوت سخن رود
آن نیز نامور ز نشانِ محمدست

غالب، ثنای خواجه به یزدان گزاشتیم؛
کان ذاتِ پاك مرتبه دانِ محمدست



عمریست که می میرم و مردن نتوانم
در کشورِ بیدادِ تو فرمانِ قضا نیست

جنت نکند چارۂ افسردگیء دل :
تعمیر باندازۂ ویرانیء ما نیست

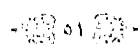
فریاد ، ز زخمی که نمك سود نباشد !
هنگامه بیفزای ؛ که پرسش بسزا نیست

برگشتنِ مژگانِ تو از روی عتابست
کاندر دلم، از تنگیء جا، یك مژه جا نیست



رشكِ دهانت گزاشت ، غنچۂ گل چون شگفت
دید که از روی کار پرده بر افتاده است

آن همه آزادگی ، و این همه دلدادگی !
حیف که غالب ز خویش بیخبر افتاده است !

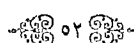


در گَردِ ناله ، وادیء دل رزمگاهِ کیست ؟
خونی که میدود بشرائین ، سپاهِ کیست ؟

رشك آیدم بروشنیء دیده های خلق
دانسته ام که از اثرِ گردِ راهِ کیست

با من بخوابِ ناز و من از رشك بد گمان :
تا عرصهٔ خیالِ عدو جلوه گاهِ کیست ؟

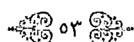
بیخود ، بوقتِ ذبح ، تپیدن گناهِ من !
دانسته ، دشنه تیز نکردن گناهِ کیست ؟



یاد از عدو نیارم و این هم ز دوربینیست
کاندر دلم گزشتن ، با دوست همنشینیست

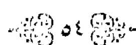
در عالمِ خرابی ، از خیلِ منعمانم
سیلم برخت شوئی ، برقم بخوشه چینیست

نازم بزود یابی ؛ نازد بگوش و گردن
چندان که ابرِ نیسان در گوهرآفرینیست



فریبِ آشتیئی ده ، ظفر مبارك باد !
دلِ ستم‌زده در بندِ امتحانِ تو نیست

گمانِ زیست بود بر مَنّت ز بیدردی
بد است مرگ ؛ ولی بدتر از گمانِ تو نیست



ایکه گفتی : « غم درونِ سینه جان‌فرساست » ، هست
خامشیم ، اما اگر دانی که حق با ماست ، هست

این سخن حق بود و گاهی بر زبانِ ما نرفت
چون تو خود گفتی که « خوبان را دل از خاراست » : هست

باری از خود گو که چونی ؛ ور ز من پرسی ، بپرس
بختِ ناساز است ؟ آری ؛ یارِ بی‌پرواست ؟ هست

خوی یارت را تو دانی ؛ ورنه از حسن و جمال
زلفِ عنبربوست ؟ دارد ؛ عارضِ زیباست ؟ هست

صبر وانگاه از تو، پنـدارم، نه حدِّ آدمیست
واینکه می‌گوئی : « بظاهر گرمِ استغناست » ، هست

۵۵

سینـه بکشودیم و خلق دید کاینجا آتشست
بعد ازین ، گوینـد آتش را که « گویا آتشست »

هم بدین نسبت ز شوخی در دلت جا کرده‌ایم
فاش گوئیم : « از تو سنگست ، آنچه از ما آتشست »

پاك خور امروز و زنهـار از پیء فردا منـه !
در شریعت ، باده امروز آب و فردا آتشست

۵۶

بخود رسـیدنش ، از ناز، بسکه دشوارست
چو ما ، بدامِ تمنـای خود گرفتـارست

تمـامِ زحمتم ؛ از هستیم چه می‌پرسی !
ز جسمِ لاغرِ خویشم ، به پیرهن خارست

بقامتِ من ، از آوارگیست پیرهنی
که خارِ رهگزرش پود و جاده اش تارست

غمم شنیدن و لختی بخود فرورفتن
خوشا فریبِ ترحم! چه ساده پرکارست!

-۵۷-

سمومِ وادیء امکان، ز بس، جگرتابست
گدازِ زهرهٔ خاکست، هر کجا آبست

مرنج از شبِ تار و بیا به بزمِ نشاط
که پنبهٔ سرِ مینای باده مهتابست

ز وضعِ روزنِ دیوار، میتوان دانست
که چشمِ غمکدهٔ ما براهِ سیلابست

قوی فتاده چو نسبت ، ادب مجو ، غالب
ندیدهٔ که سوی قبله پشتِ محرابست؟

۵۸

نازم نگهِ شرم که دلها ز میان برد
زانسان که خود آن چشمِ فسون‌ساز ندانست

یک چند بهم ساخته، ناکام گزشتیم:
من عشوه نه پزرفتم و او ناز ندانست

گریم که برد موجهٔ خون خوابگهش را
در ناله، مرا دوست ز آواز ندانست

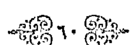
مخمورِ مکافات به خلد و سقر آویخت!
مشتاقِ عطا شعله ز گل باز ندانست!

۵۹

هر ذرّه محوِ جلوهٔ حسنِ یگانه‌ایست
گوئی، طلسمِ شش جهت آئینه‌خانه‌ایست

حیرت بدهر، بی سر و پا، می‌برد مرا
چون گوهر، از وجودِ خودم آب و دانه‌ایست

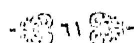
ناچار، با تغافلِ صیاد ساختم
پنداشتم که حلقهٔ دام آشیانه ایست



هرچه فلك نخواستست، هیچ کس از فلك نخواست
ظرفِ فقیه مَی نجُست، بادهٔ ما گزك نخواست

غرقه بموجه تاب خورد، تشنه ز دجله آب خورد
زحمتِ هیچ یك نداد، راحتِ هیچ یك نخواست

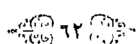
سهل شمرد و سرسری، تا تو ز عجز نشمری
غالب اگر، بداوری، دادِ خود از فلك نخواست



ما لاغریم، گر کمرِ یار نازکست
فرقیست درمیانه که بسیار نازکست

دارم دلی، ز آبله نازك نهاد تر
آهسته پا نهم که سرِ خار نازکست

می رنجد ، از تحمّلِ ما ، بر جفای خویش
هان شکوهٔ که خاطرِ دلدار نازکست !

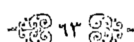

۶۲

در کشاکشِ ضعفم ، نگسلد روان از تن :
اینکه من نمی‌میرم ، هم ز ناتوانیهاست

از خمیدنِ پشتم ، روی بر قفا باشد
تا چها ، درین پیری ، حسرتِ جوانیهاست !

کشتهٔ دلِ خویشم ، کز ستمگران یکسر
دید دلفریبی‌ها ، گفت : « مهربانیهاست »

ایکه اندرین وادی ، مژده از هما دادی !
بر سرم ، ز آزادی ، سایه را گرانیهاست


۶۳

داد از تظلّمی که بگوشت نمی رسد !
آه از توقعی که وجودش نمانده است !

غالب زبان بریده و آگنده گوش نیست
اما دماغِ گفت و شنودش نمانده است

۶۴

از دوست، میلِ قرب به کشتن، غنیمتست
گر تیغ، ور کمان، به نشاطِ کمند نیست

آن لابه های مهرفزا را محل نماند
برخوان خود «اِنْ یکاد»؛ که ما را سپند نیست

۶۵

منعِ ما از باده، عرضِ احتسابی بیش نیست
محتسب، افشردهٔ انگور آبی بیش نیست

رنج و راحت برطرف! شاهد پرستانیم ما
دوزخ، از سرگرمیِ نازش، عتابی بیش نیست

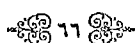
قطره و موج و کف و گرداب جیحونست و بس
این من و مائی که می بالد، حجابی بیش نیست

خویش را، صورت‌پرستان هرزه رسوا کرده اند!
جلوه می نامند و در معنی نقابی بیش نیست

شوخیِ اندیشهٔ خویشست، سر تا پای ما
تار و پودِ هستیِ ما پیچ و تابی بیش نیست

نامه‌بر، از پیشگاهِ ناز، مکتوبِ مرا
پاسخی آورده است؛ اما جوابی بیش نیست

چند رنگین نکتهٔ دلکش؛ تکلف برطرف!
دیده ام دیوانِ غالب: انتخابی بیش نیست

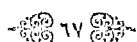


لذتِ عشقم، ز فیضِ بینوائی، حاصلست
آنچنان تنگست دستِ من که، پنداری، دلست

بسکه ضبطِ مشقِ غم فرسود اعضای مرا
رازِ دل از همنشینانم نهفتن مشکلست

عقل در اثباتِ وحدت خیره می‌گردد چرا؟
هرچه جز هستیست هیچ وهرچه جزحق باطلست

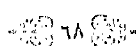
ما همان عینِ خودیم؛ اما خود از وهمِ دوئی
درمیانِ ما و غالب، ما و غالب حائلست



هم وعده و هم منع ز بخشش، چه حسابست؟
جان نیست؛ مکرر نتوان داد: شرابست

در مژده ز جوی عسل و کاخِ زمرد
چیزی که به دلبستگی ارزد، میِ نابست

با این همه دشوارپسندی، چه کند کس؟
تا پرده برانداخته، در بندِ حجابست



ریگ در بادیهٔ عشق روانست هنوز
تا چها پای درین راه بفرسودن رفت!

باخت از بسکه زلیخا، به تماشای تو، رنگ؛
از حیا، بر درِ زندان بگل اندودن رفت

۶۹

نظاره عرضِ جمالت ز نوبهار گرفت
شکوهِ صاحبِ خرمن ز خوشه‌چین پیداست

رسید تیغِ توام بر سر و ز سینه گزشت
زهی شگفتگیِ دل، که از جبین پیداست!

بجرمِ دیدهٔ خونبار، کشتهٔ ما را
ترا ز دامن و ما را ز آستین پیداست

زهی شکوهِ تو! کاندر طرازِ صورتِ تو
ز خود برآمدنِ صورت‌آفرین پیداست

۷۰

گر بار نیست، سایه خود از بید بوده است
باری، بگو که «از تو چه امّید بوده است»

ظالم هم، از نهادِ خود، آزار میکشد
بر فرقِ اره، ارّهٔ تشدید بوده است

۷۱

یار، در عهدِ شبابم، بکنار آمد و رفت
همچو عیدی که در ایامِ بهار آمد و رفت

برق، تمثالِ سراپای تو میخواست کشید
طرزِ رفتارِ ترا آئنه دار آمد و رفت

هله! غافل، ز بهاران چه طمع داشتهٔ؟
گیر، کامسال برنگینیء پار آمد و رفت

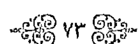
۷۲

اختری خوشتر ازینم بجهان می بایست
خردِ پیرِ مرا بختِ جوان می بایست

بزمیی که بآهنگِ غزل بنشینم
خاك گلبوی و هوا مشك فشان می بایست

برتابم بسبو باده ز دور آوردن؛
خانهٔ من بسرِ کوی مغان می بایست

هرزه، دل بر در و دیوار نهادن نتوان
سویم، از روزنه، چشمی نگران می بایست

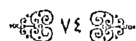


در دلش جوئی و در دیر و حرم نشناسی :
تا چه روداد، که در زاویه پنهان شده است ؟

گفتم : «البته ز من شاد بمردن گردی»
گفت : «دشوار؛ که مردن بتو آسان شده‌است»

دُردِ روغن بچراغ، و کدرِ می بایاغ
تا خود از شب چه بجا ماند که مهمان شده‌است ؟

شاهد و می ز میان رفته و شادم بسخن :
کِشته‌ام بید درین باغ که ویران شده است ؟



فغان! که برقِ عتابِ تو آن چنانم سوخت
که راز در دل و مغز اندر استخوانم سوخت

شنیــدهٔ که بآتش نه سوخت ابراهیم
ببین که بی شرر و شعله می توانم سوخت

مرا دمیــدنِ گل در گمان فگند امروز
که باز بر سرِ شاخِ گل آشیانم سوخت

۷۵

گفتم : « بروزگار سخنور چو من بسیست »
گفتند : « اندرین که تو گفتی سخن بسیست »

معنی غریبِ مدعی و خانه زادِ ماست :
هرجا عقیق نادر و اندر یمن بسیست

مشکین غزاله ها ، که نه بینی بهیچ دشت
در مَرغزارهای ختا و ختن بسیست

در صفحه نبُوَدم همهٔ آنچه در دلست :
در بزم کمترست گل و در چمن بسیست

۷۶

چو صبحِ من، ز سیاهی، بشام مانَندست
چه گوئیَم که «ز شب چند رفت یا چندست»؟

به رنج، از پیء راحت، نگاهداشته اند
ز حکمتست که پای شکسته در بندست

ز بیمِ آن که، مبادا، بمیرم از شادی
نگوید، ارچه بمرگِ من آرزومندست

اگر نه بهرِ من، از بهرِ خود عزیزم دار؛
که بنده، خوبیء او خوبیء خداوندست

نه آن بود که وفا خواهد از جهان غالب
بدین، که پرسد و گویند: «هست»، خرسندست

۷۷

تُرکِ مرا، ز گیر و دار، شُغل غرض بود، نه سود
فربه اگر نیافت صید، خُرده به لاغری گرفت

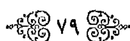


۷۸

در هر مژه برهم زدن ، این خلق جدیدست
نظاره سگالد که همانست و همان نیست

در شاخ بود موجِ گل، از جوشِ بهاران
چون باده بمینا که نهانست و نهان نیست

پهلو بشگافید و به بینید دلم را
تاچند بگویم که چسانست و چسان نیست !



۷۹

دل بُرد و حق آنست که دلبر نتوان گفت
بیداد توان دید و ستمگر نتوان گفت

در رزمگهش، ناچخ و خنجر نتوان برد
در بزمگهش، باده و ساغر نتوان گفت

رخشندگیء ساعد و گردن نتوان جُست
زیبندگیء یارهٔ و پَرگَر نتوان گفت

پیوسته دهد باده و ساقی نتوان خواند
همواره تراشد بت و آزر نتوان گفت

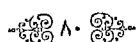
از حوصله یاری مطلب؛ صاعقه تیزست
پروانه شو، اینجا ز سمندر نتوان گفت

هنگامه سرآمد، چه زنی دم ز تظلّم؟
گر خود ستمی رفت، بمحشر نتوان گفت

در گرم روی، سایه و سرچشمه نجوئیم
با ما، سخن از طوبی و کوثر نتوان گفت

آن راز که در سینه نهانست، نه وعظست
بر دار توان گفت و به منبر نتوان گفت

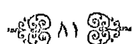
کاری عجب افتاد بدین شیفته ما را!
مومن نبود غالب و کافر نتوان گفت



اندوده بداغی، دو سه پرکاله فرو ریخت
چون برگِ شقائق، جگر، از ناله، فرو ریخت

بر ساده دلانت، بوفا جلوه همی داد
بیدادِ تو آبِ رخِ دلّاله فرو ریخت

رشکِ خطِ روی تو گر افشرد بدین رنگ
بینی که مه از دائرهٔ هاله فرو ریخت



خواست کز ما رنجد و تقریبِ رنجیدن نداشت
جرمِ غیر از دوست پرسیدیم و پرسیدن نداشت

آمد و از تنگیِ جا جبهه پرچین کرد و رفت
بر خود، از ذوقِ قدومِ دوست، بالیدن نداشت

گل فراوان بود و می پرزور، دوشم بر بساط
خود بخود پیمانه می گردید و گردیدن نداشت

جوشِ حسرت برسرِ خاکم، ز بس، جا تنگ کرد
همچو نبضِ مرده، دودِ شمع جنبیدن نداشت

۸۲

ترا که موجهٔ گل تا کمر بود، دریاب
که غرقِ خون بدرِ بوستان سرای تو کیست؟

بلا، به صورتِ زلفِ تو، رو بما آورد
به بندِ خصمیء دهریم؛ مبتلای تو کیست؟

فرشته! معنیء «مَنْ رَبُّكَ؟» نمی‌فهمم
بمن بگوی که «غالب، بگو، خدای تو کیست؟»

۸۳

بوادئی که دران خضر را عصا خفتست
بسینه می‌سپرم ره، اگرچه پا خفتست

به صبحِ حشر، چنین خسته روسیه خیزد
که در شکایتِ درد و غمِ دوا خفتست

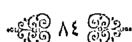
هوا مخالف و شب تار و بحر طوفان خیز
گسسته لنگرِ کشتی و ناخدا خفتست

غمت بشهر شبیخون زنان، به بُنگهِ خلق
عسس بخانه و شه در حرم سرا خفتست

درازیء شب و بیداریء من، این همه نیست
ز بختِ من خبر آرید، تا کجا خفتست

دگر ز ایمنیء راه و قربِ کعبه چه حظ؟
مرا که ناقه ز رفتار ماند و پا خفتست

بخواب، چون خودم آسوده دل مدان، غالب
که خسته غرقه بخون خفته است، تا خفتست


٨٤

کشته را رشکِ کشتهٔ دگر است
من و زخمی که بر دل از جگر است!

مستی اندازِ لغزشی دارد
حیفِ پائی که آفتش ز سر است!

شه حریر و گدا پَلاس بُرید
آنچه من قطع کرده ام، نظر است

۸۵

نامه، از سوزِ درونم، به رقم سوخته شد
قاصد ار دم زند از حوصله، پیغامی هست

گه رخ آرائی و گه زلفِ سیه تاب دهی
یاد ناری که مرا تیره سرانجامی هست

بی تو گر زیسته ام، سختیء این درد بسنج
بگزر از مرگ که وابسته بهنگامی هست

میء صافی ز فرنگ آید و شاهد ز تتار
ما ندانیم، که بغدادی و بسطامی هست؟

۸۶

گیرم، ز داغِ عشقِ تو، طرفی نه بست دل
اینم نه بس بود که جگر روشناسِ کیست؟

از بیکسانِ شهرم و از ناکسانِ دهر
گر کشتهٔ، سرِ تو سلامت! هراسِ کیست؟



آنکه ، بی پرده ، بصد داغِ نمایانم سوخت
دیده پوشید و گمان کرد که پنهانم سوخت

نه بدر جسته شرار و نه بجا مانده رماد
سوختم ؛ لیك ندانم ، بچه عنوانم سوخت

سودم از ارزشم افزون بود : آن خار و خسم
کز پیء پشّه ، توان در چمنستانم سوخت

کردم از سنگ جگر ، تا نشوم خستهٔ عشق
هم بدان سنگ بهم خوردنِ پیکانم سوخت

دیگر از خاتمهٔ کفر چه گویم ، غالب ؟
من که رخشندگیء جوهرِ ایمانم سوخت



در بذلِ لآلی ، وَرَقم دستِ کریمست
نی نی ، نیء کلکم رگِ مژگانِ یتیمست

رشحِ کفِ جم می‌چکد از مغزِ سفالم
سیرابیِ نطقم اثرِ فیضِ حکیمست

از آتشِ لهراسپ نشان می‌دهد، امروز
سوزی که بخاکم، ز تو، در عظمِ رمیمست

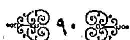
۸۹

افغانِ مرا بیهشیِ ساختهٔ نیست
در زمزمهٔ، بوی جگر سوختهٔ هست

در دیده، ز رخ پرده برانداختهٔ نیست
در سینه، دو صد عربده اندوختهٔ هست

زان سوی، بمیدانِ وفا تاختهٔ نیست
زین سو، هوسِ جان سپری توختهٔ هست

در راهِ ثوابش، قدِ افراختهٔ نیست
در بزمِ عتابش، رخِ افروختهٔ هست



۹۰

با من که عاشقم ، سخن از ننگ و نام چیست ؟
در امرِ خاص حجتِ دستورِ عام چیست ؟

مستم ز خونِ دل ، که دو چشمم ازان پُر است
گوئی : «مخور شراب» و نه بینی ، بجام چیست

دلخستهٔ غمیم و بود مَی دوای ما
با خستگان حدیثِ حلال و حرام چیست ؟

از کاسهٔ کرام ، نصیبست خاك را
تا از فلك نصیبهٔ کاسِ کرام چیست ؟

نیکی ز تست ؛ از تو نخواهیم مزدِ کار
ور خود بدیم ، کارِ تو ایم ؛ انتقام چیست ؟

غالب اگر نه خرقه و مصحف بهم فروخت
پرسد چرا که نرخِ مَیء لعل فام چیست ؟

۹۱

چون اصلِ کار در نظرِ همنشین نبود
بیچاره خرده بر روشِ جستجو گرفت!

گفتم: «خود از مشاهده بخشایش آورد»
خوش باد حالِ دوست که حالم نکو گرفت!

فرمان روا نه گشت مسلمان بهیچ عصر:
گر رفت مغ ز میکده، ترسا فروگرفت

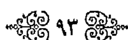
رضوان چو شهد و شیر به غالب حواله کرد
بیچاره باز داد و میء مشك بو گرفت!

۹۲

غبارِ طرفِ مزارم به پیچ و تابی هست
هنوز، در رگِ اندیشه اضطرابی هست

ببانگِ صور، سر از خاك بر نمی دارم
هنوز، در نظرم چشمِ نیمخوابی هست

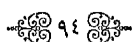
بهارِ هند بود برشکال ، هان ! غالب
درین خزان‌کده هم ، موسمِ شرابی هست



نه هرزه ، همچو نی ، از مغزم استخوان خالیست
که جای نالهٔ زاری درین میان خالیست

روم بکعبه ز کوی تو و ز حق خجلم
ز سجده جبهه و از پوزشم زبان خالیست

خرابِ ذوقِ بر و دوشِ کیستم ، غالب ؟
که چون هلال ، سراپایم از میان خالیست



شگافی ار جگرِ ذرّه ، نم برون ندهد
بوادیٔ که مرا بار در گِل افتادست

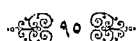
درین روش ، بچه امید دل توان بستن ؟
میانهٔ من و او شوق حایل افتادست

به صبر کم نیَم؛ اما عیارِ ایّوبی
بقدرِ آن که گرفتند، کامل افتادست

بروی صیدِ تو، از ذوقِ استخوانِ تنش
هما، ز تیزیء پرواز، بسمل افتادست

چو اندر آئنه، با خویش لابه‌ساز شوی
ز خود بجوی که ما را چه در دل افتادست

حریفِ ما همه بی‌بذله می خورد، غالب
مگر ز خلوتِ واعظ به محفل افتادست؟


۹۵

ایمنیم از مرگ، تا تیغت جراحت‌بار هست
روزیء ناخوردهٔ ما در جهان بسیار هست

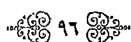
ما و خاکِ ره‌گزر بر فرقِ عریان ریختن!
گل کسی جوید که او را گوشهٔ دستار هست

بر سرِ کوی تو، با مهرم بجنگ آرد همی
این هجومِ ذرّه کاندر روزنِ دیوار هست

در پرستش سستم و در کام‌جوئی استوار :
بادشه را بندهٔ کم خدمتِ پُرخوار هست

دور باش از ریزه‌های استخوانم ، ای هما !
کاین بساطِ دعوتِ مرغانِ آتش‌خوار هست

کهنه نخلِ تازه از صرصر ز پا افتاده ام
خاکم ار کاوی ، هنوزم ریشه در گلزار هست



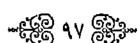
چشمم از ابر اشکبارترست
از عرق ، جبههٔ بهار ترست

گریه کرد از فریب و زارم کُشت
نگه از تیغ آبدارترست

ای که خوی تو همچو روی تو نیست !
دیده از دل امیدوارترست

خسته از راهِ دور می‌آیم
پا ز تن پارهٔ فگارترست

شکوه از خوی دوست نتوان کرد
بادهٔ تند سازگارترست
میرسد ، گر بخویشتن نازد
غالب از خویش خاکسارترست



ظهورِ بخششِ حق را ذریعه بی سببیست
وگرنه شرمِ گنه در شمارِ بی ادبیست

رموزِ دین نشناسم درست ، و معذورم
نهادِ من عجمی و طریقِ من عربیست

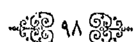
نشاطِ جم طلب از آسمان ، نه شوکتِ جم
قدح مباش ز یاقوت ، باده گر عنبیست

بود بطالعِ ما آفتابِ تحت الأرض
فروغِ صبحِ ازل ، در شرابِ نیم‌شبیست

نه هم پیالگیء زاهدان بلائی بود ؟
خوشست ، گر میء بیغش خلافِ شرع نبیست

عبودیت نکند اقتضای خواهشِ کام
دعا بصیغهٔ امرست و امر بی ادبیست

میانِ غالب و واعظ نزاع شد ، ساقی
بیا به لابه ؛ که هیجانِ قوّتِ غضبیست



نشاطِ معنویان از شرابخانهٔ تُست
فسونِ بابلیان فصلی از فسانهٔ تست

بجام و آئنه ، حرفِ جم و سکندر چیست ؟
که هرچه رفت بهر عهد ، در زمانهٔ تست

هم از احاطهٔ تست این که در جهان ما را
قدم به بتکده و سر بر آستانهٔ تست

سپهر را ، تو بتاراجِ ما گماشتهٔ
نه هرچه دزد ز ما برد ، در خزانهٔ تست ؟

ش

محوِ خودست، لیك نه چون من، درین چه بحث؟
او چون خودی نداشته دشمن، درین چه بحث؟

افسانه گوست غیر؛ چه مهر افگنی برو؟
غم برنتابد این همه گفتن؛ درین چه بحث؟

جیحون و نیل نیست، دلست؛ از خدا بترس!
گر نیست خونِ دیده بدامن، درین چه بحث!

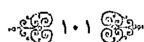
بعد از حزین، که رحمتِ حق بر روانش باد!
ما کرده ایم پرورشِ فن؛ درین چه بحث؟

او جسته جسته غالب و من دسته دسته ام
عرفی کسیست، لیك نه چون من؛ درین چه بحث؟

ج

نقشم گرفته دوست؛ نمودن چه احتیاج؟
آئینهٔ مرا بزدودن چه احتیاج؟

با پیرهن ، ز ناز ، فرو میرود بدل
بندِ قبای دوست کشودن چه احتیاج ؟
چون میتوان بره‌گزرِ دوست خاك شد
بر خاكِ راه ، ناصیه سودن چه احتیاج ؟
در دستِ دیگریست ، سفید و سیاهِ ما
با روز و شب ، بعربده بودن چه احتیاج ؟



جلوه می‌خواهیم ، آتش شو ، هوای ما مسنج
دستگاهِ خویش بین و مدعای ما مسنج
همنشین ! دارو ده و دل در خدای پاك بند
میروی از کار ؛ دردِ بی دوای ما مسنج
ای که نعشِ ما بری ! پندارم ، از ما بودهٔ
دست مزدِ او چه داری ؟ خونبهای ما مسنج
زاریء ما در غمِ دل دید و شادی مرگ شد
مردنِ دشمن ز تاثیرِ دعای ما مسنج

درگزر زین پرده ، چون دمسازِ غالب نیستی
مدعی ! هنجارِ خود گیر و نوای ما مسنج

چ

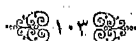
در پرده شکایت ز تو داریم ، و بیان هیچ
زخمِ دلِ ما جمله دهانست ، و زبان هیچ

ای حسن ! گر از راست نرنجی ، سخنی هست :
ناز این همه ، یعنی چه ؟ کمر هیچ و دهان هیچ

عالم همه مرآتِ وجودست ؛ عدم چیست ؟
تا کار کند چشم ، محیطست و کران هیچ

در پردهٔ رسوائیء منصور نوائیست
رازت نشنودیم ازین خلوتیان هیچ

غالب ، ز گرفتاریء اوهام برون آی
بالله ! جهان هیچ و بد و نیکِ جهان هیچ



موجه از دریا، شعاع از مهر، حیرانی چراست؟
محوِ اصلِ مدعا باش و بر اجزایش مپیچ

آسمان وهمست؛ از برجیس و کیوانش مگوی
نقشِ ما هیچست؛ بر پنهان و پیدایش مپیچ

دل از آنِ تست و نعمتهای الوانش تراست
سخت درهم، چون سِماطِ خوانِ یغمایش مپیچ

پیش ازین کی بود؟ این هم التفاتی بوده است
اینقدر بر خود، ز رنجشهای بیجایش، مپیچ

نعشِ غالب همچنین بر جا گزار؛ آخر شبست
خیز و در کُحلی پرندِ گوهرآمایش مپیچ



پیش ازین، بادِ بهار این همه سرمست نبود
شبنمِ ماست که تر کرده دماغِ دمِ صبح

حقِ آن گرمیء هنگامه که دارم بشناس
ای که در بزمِ تو مانم بچراغِ دمِ صبح!

خ

ای جمالِ تو، بتاراجِ نظرها، گستاخ!
وی خرامِ تو، بپامالیء سرها، گستاخ!

داغِ شوقِ تو، به آرایشِ دلها، سرگرم!
زخمِ تیغِ تو، به گلگشتِ جگرها، گستاخ!

۱۰۶

با تو شد همسخن، پیامگزار
چه شکیبم بارزشِ پاسخ؟

قاصدِ من براه مرده و من
همچنان در شمارهٔ فرسخ!

مرگِ غالب دلت بدرد آورد
خویش را کشت و هرزه کشت، آوخ!

د

ز قاتلی بعذابم، که تیـغ و خنجر را
بحکمِ وسوسه، زهراب بی شگون ندهد!
بمن گرای و وفا جو؛ که ساده برهمنم:
بسنگ هرکه دهد دل، بغمزه چون ندهد؟

۱۰۸

نگاهش ار بسرِ نامــهٔ وفا ریزد
سوادِ صفحه ز کاغذ، چو توتیا، ریزد
بفرقِ ما اگرش ناگهان گزار افتد
چو گرد، سایه ز بال و پرِ هما ریزد

۱۰۹

به بندِ پرسشِ حالم نمی توان افتاد
توان شناخت ز بندی که بر زبان افتاد
هم از تصرفِ بیتـابیء زلیخا بود
بچاهِ یوسف، اگر راهِ کاروان افتاد

۱۱۰

غم چو بہم درافگند، رو که مراد میدهد:
دانه ذخیره می‌کند، کاه بباد میدهد

مستِ عطای خود کند ساقی، ما، نه مستِ می:
داده ز یاد می‌برد، بسکه زیاد میدهد

۱۱۱

دل، اسبابِ طرب گم کرده، در بندِ غمِ نان شد
زراعت‌گاهِ دهقان می‌شود، چون باغ ویران شد

خدا را، ای بتان! گردِ دلش گردیدنی دارد
دریغا آبروی دیر! گر غالب مسلمان شد

۱۱۲

راز از سینه بمضراب نریزیم برون
سازِ عاشق، ز شکستن، بصدا می‌آید

رفته، در حسرتِ نقشِ قدمی، عمر بسر
جادهٔ را که بسر منزلِ ما می‌آید

۱۱۳

خوشست آن که با خویش جز غم ندارد
ولی خوشترست آن که این هم ندارد

گُلت را نوا ، نرگست را تماشا :
تو داری بهاری که عالم ندارد

۱۱٤

مژدهٔ صبح درین تیره شبانم دادند
شمع کشتند و ز خرشید نشانم دادند

رخ کشودند و لبِ هرزه سرایم بستند
دل ربودند و دو چشمِ نگرانم دادند

هرچه در جزیه ز گبران میء ناب آوردند
بشبِ جمعهٔ ماهِ رمضانم دادند

هرچه از دستگهِ پارس به یغما بردند
تا بنالم ، هم ازان جمله زبانم دادند

۱۱۵

تا کَیَم ، دودِ شکایت ز بیان برخیزد؟
بزن آتش که شنیدن ز میان برخیزد

می رمی از من و خلق بگمانست ز تو
بیمحابا شو و بنشین که گمان برخیزد

جزوی از عالمم و از همه عالم بیشم
همچو موئی که بتان را ز میان برخیزد

۱۱۶

گویم سخنی ، گرچه شنیدن نشناسد
صبحیست شبم را که دمیدن نشناسد

بی پرده شو از ناز و میندیش ؛ که ما را
چون آئنه ، چشمیست که دیدن نشناسد

پیوسته روان از مژه خونِ جگرستم
رنگیست رخم را که پریدن نشناسد

۱۱۷

هردم ، ز نشــاطم ، دلِ آزاد بجنبد
تا کیست درین پرده که بی باد بجنبد ؟

۱۱۸

گم شد نشانِ من ، چو رسیدم بکنجِ دیر
مانندِ آن صدا که بگوشِ گران رسد

در دام بهرِ دانه نیفتم ؛ مگر قفس
چندان کنی بلند که تا آشــیان رسد

امیدِ غلبه نیست ، بکیشِ مغان درآی
می ، گر بجزیه دست نداد ، ارمغان رسد

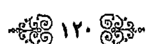
۱۱۹

عاشق ، چو گفتیش که « برو » ، زود میرود
نازم بخواجــگی ! غضب آلود مــیرود

از ناله ام مرنج ؛ که آخر شدست کار
شمــعِ خموشم و ز سرم دود مــیرود

رشکِ وفا نگر، که بدعوی‌گهِ رضا
هر کس چگونه درپیء مقصود میرود

فرزند زیرِ تیغِ پدر می‌نهد گلو
گر خود پدر در آتشِ نمرود میرود


۱۲۰

دانست کز شهادتم امیدِ حور بود
برگشتنم ز دین، دمِ بسمل، ضرور بود

رفت آن که ما ز حسن مدارا طمع کنیم
سررشته، در کفِ «اَرِنِی» گوی طور، بود

مجرم مسنج رندِ «اَنَا الحَق» سرای را
معشوقه خودنمای و نگهبان غیور بود

نازم بامتیاز که بگزشتن از گناه
با دیگران ز عفو و بما از غرور بود!

۱۲۱

ز گرمیء نگهت ، خونِ دل بجوش آمد
ز شادیء ستمت ، سینه در خروش آمد
بجان نوید که شرم از میانهٔ هم رفت !
به عیش مژده که وقتِ وَداع هوش آمد !
ز وصلِ یار قناعت ، کنون ، به پیغامیست
خزانِ چشم رسید و بهارِ گوش آمد

۱۲۲

جان ، بر سرِ مکتوبِ تو ، از شوق فشاندن
از عهدهٔ تحریرِ جوابم بدرآورد

۱۲۳

گرسنه به که برآید ز فاقه جانش و لرزد
ازانکه در رسد از راه میهمانش و لرزد
نفس ، بگردِ دل از مهر، می تپد بفراقت
چو طایری که بسوزانی آشیانش و لرزد

۱۲٤

آنانکه وصلِ یار همی آرزو کنند
باید که خویش را بگدازند و اُوْ کنند

وقتست کز روانیء می ، ساقیانِ بزم
پیمانه را حبابِ لبِ آبجو کنند

آلودهٔ ریا نتوان بود ، غالبا !
پاکست خرقهٔ که به مَی شست وشو کنند

۱۲۵

چون گویم ، از تو بر دلِ شیدا چه میرود ؟
بنگر ، بر آبگینه ز خارا چه میرود ؟

گوئی : « مباد ! در شکنِ طرّه خون شود »
دل زانِ تست ، از گرهِ ما چه میرود ؟

هفت آسمان بگردش و ما در میانه ایم
غالب ، دگر مپرس که بر ما چه میرود

۱۲۶

نه از شرمست کز چشمِ وی آسان بر نمی آید
نگاهش ، با درازیهای مژگان ، بر نمی آید

سرت گردم! بزن تیغ و دری بر روی دل بکشا
دلم تنگست ؛ کار از زخمِ پیکان بر نمی آید

بدوشِ خلق نعشم ، عبرتِ صاحبدلان باشد
بپای خود ، کسی از کوی جانان بر نمی آید

۱۲۷

چه عیش از وعده، چون باور ز عنوانم نمی آید؟
بنوعی گفت : «می آیم» که میدانم نمی آید

گزشتم زانکه بر زخمِ دلِ صد پاره خون گرید
خود او را خنده ، بر چاكِ گریبانم ، نمی آید

براهِ کعبه زادم نیست ؛ شادم کز سبکباری
برفتن ، پای بر خارِ مغیلانم نمی آید

دبیرم ، شاعرم ، رندم ، ندیمم ؛ شیوه‌ها دارم
گرفتم ، رحم بر فریاد و افغانم نمی‌آید

۱۲۸

چون پوئی بزمین ، چرخ زمینِ تو شود
خوش بهشتیست که کس راه‌نشینِ تو شود !

چون بسنجد که نه آنست ، بکاهد از شرم
ماه یک‌چند ببالد که جبینِ تو شود

۱۲۹

دل در افروختنش منتِ دامن نکشید
شادم از آه که هم آتش و هم باد آمد !

خیز و در ماتمِ ما سرمه فروشوی ز چشم
وقتِ مشاطگیِ حسنِ خداداد آمد

بر درِ یار چه غوغاست ؟ عزیزان ، بروید
خونبها مزدِ سبکدستیِ جلاد آمد

۱۳۰

دوش ، کز گردشِ بختم گله ، بر روی تو بود
چشم سوی فلك و روی سخن سوی تو بود

آنچه شب شمع گمان کردی و رفتی بعتاب
نفسم پرده‌کشای اثرِ خوی تو بود

دوست دارم گرهی را که بکارم زده‌اند
کاین همانست که پیوسته در ابروی تو بود

لاله و گل دمد از طرفِ مزارش پسِ مرگ
تا چها در دلِ غالب هوسِ روی تو بود !

۱۳۱

گر چنین نازِ تو آمادهٔ یغما ماند
به سکندر نرسد ، هرچه ز دارا ماند

در بغل دشنه نهان ساخته غالب ، امروز
مگزارید که ماتم زده تنها ماند !

۱۳۲

در کُلبهٔ ما ، از جگرِ سوخته ، بو برد
با ما گله سنجید و شماتت بعدو برد

یك گریه پس از ضبطِ دو صد گریه رِضا ده
تا تلخیء آن زهر توانم ز گلو برد

نازد به نکویان ، ز گرفتاریء غالب
گوئی ، بگرو برد دلی را که ازو برد

۱۳۳

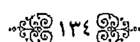
نادان صنمِ من روشِ کار نداند
بر هرکه کند رحم ، سر از بار نداند

بی دشنه و خنجر ، نبود معتقدِ زخم
دلهای عزیزان ، بغم افگار نداند

بر تشنه لبِ بادیه ، سوزد دلش ، از مهر
اندوهِ جگر تشنهٔ دیدار نداند

دل را ، بغم ، آتشکدهٔ راز نسنجد
دم را ، به تفِ ناله ، شرربار نداند

دشوار بود مردن و دشوارتر از مرگ
آنست که من میرم و دشوار نداند !



خوشم که گنبدِ چرخِ کهن فروریزد
اگرچه خود همه بر فرقِ من فروریزد

ز جوشِ شکوهٔ بیدادِ دوست می ترسم
مباد ! مهرِ سکوت از دهن فروریزد

دهد به مجلسیان باده و به نوبتِ من
بمن نماید و در انجمن فروریزد

مکن به پرسشم از شکوه منع ؛ کاین خونیست
که خود ز زخم ، دمِ دوختن ، فروریزد

۱۳۵

بوصل ، لطف باندازهٔ تحمل کن
که مرگِ تشنه بود ، آب چون ز سر گزرد

نفس ، ز آبله‌های دلم ، برآرد سر
چنان که رشته ، در آمودن ، از گهر گزرد

۱۳۶

نیست وقتی که بما کاهشی از غم نرسد
نوبتِ سوختنِ ما به جهنم نرسد

خواجه فردوس ، به میراث ، تمنا دارد
وای ! گر در روشِ نسل به آدم نرسد

هرکجا دشنهٔ شوقِ تو جراحت بارد
جز خراشی ، به جگرگوشهٔ ادهم نرسد

طوبیِٔ فیضِ تو هرجا گل و بار افشاند
جز نسیمی ، به پرستش‌گهِ مریم نرسد

۱۳۷

آزادگیست سازی ، اما صدا ندارد
از هرچه درگزشتیم ، آوازِ پا ندارد
ای سبزهٔ سرِ ره ! از جورِ پا چه نالی ؟
در کیشِ روزگاران ، گل خونبها ندارد
« بر خویشتن به بخشای » ، گفتم : « دگر تو دانی
دارم دلی که دیگر تابِ جفا ندارد »

۱۳۸

شوقم ، ز پند ، بر درِ فریاد می زند
بر آتشِ من ، آب دم از باد می زند
ممنونِ کاوشِ مژه و نیشتر نیم
دل موجِ خون ، ز دردِ خدا داد ، می زند

۱۳۹

« باید ز می هرآینه پرهیز » ، گفته اند
آری ، دروغِ مصلحت آمیز گفته اند

خون ریختن بکوی تو ، کردارِ چشمِ ماست
مردم ترا برای چه خونریز گفته اند ؟

۱٤۰

ای لاله ! بر دلی که سیه کردهٔ مناز
داغِ تو بر دماغِ که بوی کباب زد ؟

۱٤۱

ننگِ فرهادم بفرسنگ از وفا دور افگند
عشقِ کافر ، شغلِ جان دادن بمزدور افگند !

چون بجوید کام ، تا لختی پرستاری کنم ،
خویش را بر رختِ خواب ، از ناز ، رنجور افگند

وقتِ کار ، این جنبشِ خلخال کاندر ساقِ تست
حلقهٔ رغبت بگوشِ خونِ منصور افگند

۱٤۲

بره ، با نقشِ پای خویشم ، از غیرت ، سری باشد
که ترسم ، دوست‌جویان را بکویش رهبری باشد

چه گویم سوزِ دل با چون تو غم‌نادیده بدمستی
مثالی وانمایم ، گر کباب و اخگری باشد

نخواهد بود رسم آنجا ، بدیوان داوری بردن
گرفتم ، کشورِ مهر و وفا را داوری باشد

مکیدم آن قدر کز بوسه و دشنام خالی شد
لبِ یارست و حرفی چند ، گو با دیگری باشد

۱۴۳

دل نه تنها ، ز فراقِ تو ، فغان ساز دهد
رفتنِ عکسِ تو از آئنه آواز دهد

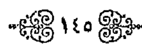
من سر از پا نشناسم برهِ سعی ، و سپهر
هردم انجامِ مرا جلوهٔ آغاز دهد

۱۴۴

کو فنا ؟ تا همه آلایشِ پندار بَرَد
از صُوَر جلوه و از آئنه زنگار برد

گفته باشی که «بهر حیله در آتش فگنش»
غیر می‌خواست، مرا بی تو بگلزار برد

خونچکانست نسیم از اثرِ نالهٔ من
کیست کز سعیِ نظر پی بدرِ یار برد؟



چاك از جیبم بدامان میرود
تا چه بر چاك از گریبان میرود؟

جوهرِ طبعم درخشانست؛ لیك
روزم اندر ابر پنهان میرود

بگزر از دشمن؛ دلش سختست سخت
آبروی تیر و پیکان میرود

کیست؟ تا گوید بدان ایوان نشین
آنچه بر غالب ز دربان میرود

۱۴۶

نومیـــدیء ما گردشِ ایام ندارد
روزی که سیه شد ، سحر و شام ندارد

بی نقشِ وجودِ تو ، سراپای من ، از ضعف
چون بسترِ خوابست که اندام ندارد

۱۴۷

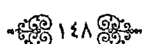
چه خیزد از سخنی کز درونِ جان نبوَد ؟
بریده باد زبانی که خونچکان نبود !

نگفته ام : « ستم از جانبِ خداست » ؛ ولی
خدا ، به عهدِ تو ، بر خلق مهربان نبود

ز خویش رفته ام و فرصتی طمع دارم
که باز گردم و جز دوست ارمغان نبود

فرو برد نفسِ سردِ من جهـــنم را
اگر نشاطِ عطـای تو درمیان نبود

بالتفاتِ نگارم، چه جای تهنیتست؟
دعا کنید که نوعی ز امتحان نبود!

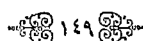


بتانِ شهر ستم پیشه شهریارانند
که در ستم روش آموزِ روزگارانند

برند دل به ادائی که کس گمان نبرد
فغان! ز پرده نشینان که پرده دارانند

نه زرع و کشت شناسند، نی حدیقه و باغ
ز بهرِ باده، هواخواهِ باد و بارانند

ز وعده گشته پشیمان و بهرِ دفعِ ملال
امیدوار به مرگِ امیدوارانند



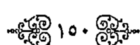
دلستانان بحِل اند، ارچه جفا نیز کنند
از وفائی که نکردند، حیا نیز کنند

خسته تا جان ندهد ، وعدهٔ دیدار دهند
عشوه ، خواهند که در کارِ قضا نیز کنند

اندران روز که پرسش رود از هرچه گزشت
کاش ! با ما سخن از حسرتِ ما نیز کنند

از درختانِ خزان دیده نباشم ؛ کاینها
ناز بر تازگیء برگ و نوا نیز کنند

حلقِ غالب نگر و دشنهٔ سعدی که سرود
«خوبرویانِ جفاپیشه وفا نیز کنند»



دماغِ اهلِ فنا نشاۂ بلا دارد
بفرقم ، ارّہ طلوعِ پرِ هما دارد

کشادِ شستِ ادای تو دلنشینِ منست
اگر خدنگِ تو در دل نشست ، جا دارد

فغان ! که رحم بدآموزِ یار شد ، غالب
روا نداشت که بر ما ستم روا دارد

۱۵۱

نقاب دار که آئینِ رهزنی دارد
جمالِ یوسفی و فرِ بهمنی دارد
بباده گر بُوَدم میل ، شاعرم ، نه فقیه
سخن چه ننگ ز آلوده دامنی دارد ؟

۱۵۲

ز رشکست این که در عشق آرزوی مردنم باشد
تو جانِ عالمی ؛ حیفست گر جان در تنم باشد
تو داری دین و ایمانی ؛ بترس از دیو و نیرنگش
چو نبود توشهٔ راهی ، چه باك از رهزنم باشد ؟

۱۵۳

حورِ بهشتی ز یاد ، آن بتِ کشمیر برد
بیمِ صراط از نهاد ، آن دمِ شمشیر برد
شبرَویِ غمزهٔ ، صبر و دل و دین ربود
جان ، که ازو باز ماند ، شحنهٔ تقدیر برد

۱۵٤

تا چند بلهوس می ، و عاشق ستم کشد ؟
کو فتـــنه ؟ تا بداوریء هم علم کشد

دل را ، بکارِ ناز چـــه سرگرم کردهٔ ؟
یعنی بخویش هم کند و از تو هم کشد

صهـبا حلال ، زاهـدِ شب زنده دار را
اما بشرطِ آن که همان صبحدم کشد

۱۵۵

گفتند حور و کوثر و دادند ذوقِ کار
منعست نامِ شاهد و می آشکار بُرْد

نعشِ مرا بسوز ؛ کم از برهمن نیَم
ننگِ نسوختن نتوان در مزار برد

پیشم ازان بپرس که پرسی و اهلِ کوی
گویند : « خسته زحمتِ خود زین دیار برد »

۱۵۶

بچشمِ مدعی ، همچون چراغِ روز ، بی‌نورم
چراغم گر ، بفرض ، از پرتوِ خرشید درگیرد
گمم در وی؛ ز رشکست اینکه غمخواری نمی‌خواهم
که ترسم یابد او را هرکه از حالم خبر گیرد
سرت گردم ! اگر پای نزاکت درمیان نبود
تنم ، از لاغری ، صد خرده بر موی کمر گیرد

۱۵۷

تنگست دلم ؛ حوصلهٔ راز ندارد
آه ! از نیء تیرِ تو که آواز ندارد
هر دلشده ، از دوست در اندازِ سپاسیست
مانا که نگاهِ غلط انداز ندارد

۱۵۸

لبم ، از زمزمهٔ یادِ تو ، خاموش مباد !
غیرِ تمثالِ تو ، نقشِ ورقِ هوش مباد !

رهروِ بادیهٔ شوق سبک‌سیرانند
بارِ سر نیز ، درین مرحله ، بر دوش مباد !

۱۵۹

هر ذره را ، فلک بزمین بوس میرسد
گر خاک راست دعوی ناموس ، میرسد

زینسان که خو گرفتهٔ عاشق‌کشیست حسن
مر شمع را شکایتِ فانوس میرسد

خود پیشِ خود کفیلِ گرفتاریء منست
هردم ، بپرسشِ دلِ مایوس میرسد

بیرون میا ز خانه ، به هنگامِ نیمروز
رشک آیدم که سایه بپابوس میرسد

۱۶۰

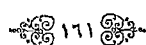
ازان سرمایهٔ خوبی ، بوصلم کامِ دل جُستن
بدان ماند که موری خرمنی را در کمین باشد

نسوزد بر خودم دل، گر بسوزد برق خرمن را
که دانم آنچه از من رفت، حقِ خوشه چین باشد

به پیرِ خانقه، در روضه یکجا خوش توان بودن
بشرطِ آن که از ما باده وز شیخ انگبین باشد

چه رفت از زهره با هاروت؟ خاکم در دهن بادا!
تو مریم باشی و کارِ تو با روح الامین باشد

ازان گردی که در راهش نشیند بر رخم، غالب
چه خیزد؟ چون هم از من رخ، هم از من آستین باشد



۱۶۱

از رشك کرد، آنچه بمن روزگار کرد
در خستگی نشاطِ مرا دید، خوار کرد

بد کرد چون سپهر بمن، گرچه من بدم،
باید بدین حساب ز نیکان شمار کرد

لنگر گسست صرصر و کشتی شکست موج
دانا خورد دریغ که نادان چه کار کرد

عمری به تیرگی بسر آورده‌ام که مرگ
شادم بروشنائیِ شمعِ مزار کرد

نومیدی از تو کفر و تو راضی نهٔ بکفر
نومیدیَم، دگر، بتو امیدوار کرد

۱۶۲

بذوقِ سر، ز مستی، در قفای رهروان دارد
که، پنداری، کمندِ یار همچون مار جان دارد

«خدارا! وقتِ پرسش نیست»، گفتم: «بگزر از غالب
که هم جان بر لب و هم داستانها بر زبان دارد»

۱۶۳

صاحبدلست و نامور، عشقم بسامان خوش نکرد
آشوبِ پیدا ننگِ او، اندوهِ پنهان خوش نکرد

آن خود ببازی می‌برد، وین را دو جو می‌نشمرد
بنمودمش دین، خنده زد؛ آوردمش جان، خوش نکرد

با من میاویز، ای پدر! فرزندِ آزر را نگر
هرکس که شد صاحب‌نظر، دینِ بزرگان خوش نکرد

۱۶۴

قدرِ مشتاقان چه داند ، دردِ ما چندش بود ؟
آنکه دایم کار با دلهای خورسندش بود
شاهدِ ما همنشین‌آرای و رنگین محفلست
لاجرم ، در بندِ خویشست آنکه در بندش بود
غالبا ! زنهار! بعد از ما ، بخونِ ما مگیر
قاتلِ ما را که حاکم آرزومندش بود

۱۶۵

چرخ ، هر روزم ، غمِ فردا بخوردن می‌دهد
تا قیامت فارغ از فکرِ معاشم کرده‌اند

۱۶۶

کسی با من چه، در صورت پرستی، حرفِ دین گوید؟
ز آزر گفت ، دانم ، گر ز صورت‌آفرین گوید

شناسد جای غم دل را و خود را دلربا داند
عجب دارد، اگر دلدادهٔ خود را غمین گوید

رهم افتاده، بهرِ دانه، سوی دامِ صیادی
که حرفِ ذَبح با همرازِ خویش اندر کمین گوید

گزارد آنچه برق از خرمن، اندر دشت بگزارم
که ترسم، چون بچینم، کس بطنزم خوشه‌چین گوید

۱٦٧

من بوفا مردم و رقیب بدرزد
نیمه لبش انگبین و نیمه تبرزد

کیست درین خانه؟ کز خطوطِ شعاعی
مِهر، نفس ریزه‌ها، به روزنِ در، زد

دعوی او را بود دلیل بدیهی
خندهٔ دندان‌نما، به حسنِ گهر، زد

کام نه بخشیدهٔ، گنه چه شماری؟
غالبِ مسکین بالتفات نیرزد

۱۶۸

بدین قدر که لبی تر کنی و من بتکم
ترا ز بادهٔ نوشین چه مایه کم گردد ؟
رسیده‌ایم بکوی تو؛ جای آن دارد
که عمر صرفِ زمین‌بوسیء قدم گردد

۱۶۹

بیدل نشد ، ار دل به بتِ غالیه‌مو داد
گوئی ، مگر آن دل که ز من برد ، باو داد
سختست دلِ غیر و گر از ننگ نگوئی
برگشتنِ مژگانِ تو گوید که چه روداد
زین ساده‌دلی داد ! که چون دید بخوابم
ترسید خود و مژدهٔ مرگم بعدو داد

۱۷۰

نهم جبین بدرش ، آستان بگرداند
نشینمش بسرِ ره ، عنان بگرداند

بزمِ باده ، به ساقیگری ، ازو چه عجب
که پیرِ صومعه را درمیان بگرداند ؟

۱۷۱

چو زه ، بقصدِ نشان ، بر کمان بجنباند
تپد ز رشك دلم ، تا نشان بجنباند

دعا کدام و چه دشنام ؟ تشنهٔ سخنیم
بکامِ ماست زبان ، چون زبان بجنباند

هنوز بیخبری زانکه جبهه بر درِ تو
نسوده ایم چنان کاستان بجنباند

۱۷۲

تیغت ، ز فرق تا بگلویم ، رسیده باد !
شوخی ز حد گزشت ؛ زبانم بریده باد !

گر رفته ام ز کوی تو ، آسان نرفته ام
این قصه از زبانِ عزیزان شنیده باد !

۱۷۳

از تیرگیء طرهٔ شبرنگ ، نظرها
پرواز، دران صبحِ بناگوش ، نکردند
گر داغ نهادند تو گر درد فزودند
نازم ، که به هنگامه فراموش نکردند!
گر خود بغلامی نه پزیرند ، گدا باش!
بر در بزن آن حلقه که در گوش نکردند

۱۷٤

تاجرِ شوق ، بدان ره ، بتجارت نرود
که ره انجامد و سرمایه بغارت نرود
تو، بیك قطرهٔ خون ، تركِ وضو گیری و ما
سیلِ خون ، از مژه رانیم و طهارت نرود
غالبِ خسته، بکوی تو، رهینِ تپشیست
که به شاهی نه نشیند ، به وزارت نرود

ر

بتی دارم ، ز شنگی ، روزگاران خو ، بهاران بر
به مستی ، خویش را گردآر و گوی از هوشیاران بر
ندارد شیر و خرما ذوقِ صهبا ؛ رحم می‌آید !
نشاطِ عید ، از ما هدیه سوی روزه داران ، بر

۱۷۶

چه جنون تازِ هوای گل و خارست ، بهار
کاین چنین قطره زن از ابرِ بهارست ، بهار
شوخیء خوی ترا قاعده دانست ، خزان
خوبیء روی ترا آئنه دارست ، بهار

۱۷۷

بیا و جوشِ تمنای دیدنم بنگر
چو اشك ، از سرِ مژگان چکیدنم بنگر
ز من ، بجرمِ تپیدن ، کناره می‌کردی
بیا بخاكِ من و آرمیدنم بنگر

شنیده ام که نه بینی، و نا امید نیم
ندیدنِ تو شنیدم، شنیدنم بنگر

دمید دانه و بالید و آشیان گه شد
در انتظارِ هما، دام چیدنم بنگر

تواضعی نکنم بی تواضعی، غالب
بسایهٔ خمِ تیغش خمیدنم بنگر



بمرگِ من! که پس از من، ز مرگِ من یاد آر!
بکوی خویشتن، آن نعشِ بی کفن یاد آر!

من آن نیم که ز مرگم جهان بهم نخورد؛
فغانِ زاهد و فریادِ برهمن یاد آر!

بیام و در، ز هجومِ جوان و پیر بکوی
بکوی و برزن، از اندوهِ مرد و زن یاد آر

خروش و زاریء من، در سیاهیء شبِ زلف
دمِ فتادنِ دل در چهِ ذقن، یاد آر

هزار خسته و رنجور در جهان داری
یکی ، ز غالبِ رنجورِ خسته تن یاد آر!

۱۷۹

بی دوست ، ز بس ، خاك فشاندیم بسر بر
صد چشمه روانست ، بدان راهگزر بر

غلتانیء اشکم بود ، از حسرتِ دیدار :
آبیست نگاهم که به پیچد به گهر بر

امید که خالِ رخِ شیرین شود ، آخر
چشمی که سیه ساخته خسرو به شکر بر

بالد بخود آن مایه که در باغ نه گنجد
سروی که کشندش ، به تمنای تو ، در بر

مطرب به غزل خوانی و غالب به سماعست
ساقی ، می و آلاتِ می از حلقه بدربر

۱۸۰

ای دل! از گلبنِ امید نشانی بمن آر
نیست گر تازه گلی، برگِ خزانی بمن آر

تا، دگر، زخم بناسور توانگر گردد
هدیهٔ از کفِ الماس فشانی بمن آر

همدمِ روزِ گدائی! سبك از جا برخیز
جان گرو، جامه گرو، رطلِ گرانی بمن آر

یا رب! این مایه وجود از عدم آوردهٔ تست
بوسهٔ چند هم، از کنجِ دهانی، بمن آر

۱۸۱

بر دل، نفسِ غمم! سرآور
چون ناله، مرا ز من برآور!

یا پایهٔ آرزو بیفزای
یا خواهشِ ما ز در درآور!

عمری ، ز هلاک تلخ تر ، رفت
مرگی ، ز حیات خوشتر ، آور!

۱۸۲

ای ذوقِ نواسنجی! بازم بخروش آور!
غوغای شبیخونی ، بر بُنگهِ هوش آور!

گر خود نجهد از سر ، از دیده فروبارم ؛
دل خون کن و آن خون را در سینه بجوش آور!

گاهی ، بسبکدستی ، از باده ز خویشم بر!
گاهی ، به سیه مستی ، از نغمه بهوش آور!

غالب ، که بقایش باد! همپای تو گر ناید ،
باری ، غزلی فردی زان موینه پوش آور

۱۸۳

در گریه ، از بس نازکی ، رخ مانده بر خاکش نگر
وان سینه سودن ، از تپش ، بر خاکِ نمناکش نگر

برقی که جانها سوختی ، دل از جفا سردش ببین
شوخی که خونها ریختی ، دست از حنا پاکش نگر

آن کو بخلوت ، با خدا هرگز نکردی التجا
نالان به پیشِ هر کسی ، از جورِ افلاکش نگر

بر آستانِ دیگری ، در شکرِ دربانش ببین
در کوی از خود کمتری ، در رشکِ خاشاکش نگر

خواند به امیدِ اثر ، اشعارِ غالب هر سحر
از نکته چینی درگزر ، فرهنگ و ادراکش نگر

ز

یا رب ! ز جنون طرحِ غمی در نظرم ریز !
صد بادیه ، در قالَبِ دیوار و درم ، ریز !

از مهرِ جهانتاب ، امیدِ نظرم نیست
این تشتِ پر ازآتشِ سوزان بسرم ریز !

هر خون که عبث گرم شود ، در دلم افگن
هر برق که بیصرفه جهد ، بر اثرم ریز !

گیرم که به افشاندنِ آلماس نیرزم
مشتی نمکِ سوده، بزخمِ جگرم ریز!

۱۸۵

ای شوق! بما عربده بسیار میاموز
ابرام بدریوزهٔ دیدار میاموز
صورتکده شد کلبهٔ من سربسر، ای چشم!
انگیختنِ نقش ز دیوار میاموز

۱۸۶

خون، قطره قطره، می چکد از چشمِ تر، هنوز
نگسسته ایم بخیهٔ زخمِ جگر، هنوز
تا خود پس از رسیدنِ قاصد چه رو دهد؟
خوش می‌کنم دلی بامیدِ خبر، هنوز

۱۸۷

یقینِ عشق کن و از سرِ گمان برخیز
به آشتی به نشین یا به امتحان برخیز

تو دودی، ای گله! کام و زبان نه درخورِ تست
بدل فروشو و از مغزِ استخوان برخیز

رقیب یافته تقریبِ رخ بپا سودن
ترا که گفت که «از بزم سرگران برخیز»؟

سبوچهٔ دهمت هر سحر ز می، غالب
خدای را! ز سرِ کوچهٔ مغان برخیز



با همه گم گشتگی، خالی بود جایم، هنوز
گاه گاهی، در خیالِ خویش می آیم، هنوز

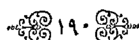
س

داغِ تلخ گویانم، لذتِ سم از من پرس
محوِ تند خویانم، حیرتِ رم از من پرس

نیست با غنودنها، برگِ پر کشودنها
از عدم برون آمد، سعیِ آدم از من پرس

تیغِ غمزه با اغیار آنچه کرد، میدانی
خنجرِ تغافل را تیزیء دم از من پرس

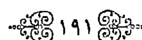
خلد را نهادم من؛ لطفِ کوثر از من جوی
کعبه را سوادم من؛ شورِ زمزم از من پرس



کاشانه نشین عشوه گری را چه کند کس؟
بی فتنه سر ره گزری را چه کند کس؟

گر سرخوشی از باده مرادست، بیاشام!
واعظ، تو و یزدان! خبری را چه کند کس؟

نا یافته بارم، به نراندن چه شکیبم!
گیرم که خود از تست، دری را چه کند کس؟



بی پرده، تابِ محرمیء رازِ ما مجوی
خون گشتنِ دل، از مژه و آستین شناس

بی غم نهادِ مرد گرامی نمی‌شود
زنهار! قدرِ خاطرِ اندوهگین شناس

۱۹۲

تیغ از نیام، بیهده، بیرون نکرده کس
ما را بهیچ کشته و ممنون نکرده کس
یا رب! بزاهدان چه دهی خلد رایگان؟
جورِ بتان ندیده و دل خون نکرده کس

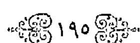
۱۹۳

رحمی از معشوق هرجا در کتابی بنگری
بر کنارِ آن ورق «جانها فدایش» می نویس

ش

دوشم، آهنگِ عشا بود که آمد در گوش
ناله از تارِ ردائی که مرا بود بدوش
کای خسِ شعلهٔ آوازِ موذن! زنهار!
از پیِ گرمیِ هنگامه، منه دل بخروش

حاصل آنست ازین جمله نبودن که مباش
ما نه افسانه سرائیم و تو افسانه نیوش !
گفتم : «از رنگ به بیرنگی اگر آرم روی
ره دگر چون سپرم؟» گفت: «ز خود دیده بپوش»
جستم از جای ، ولی هوش و خرد پیشاپیش
رفتم از خویش ، ولی علم و عمل دوشادوش
تا به بزمی که بیك وقت ، درانجا دیدم
باده پیمودنِ امروز و بخون خفتنِ دوش
همچو خرشید ، کزو ذره درخشان گردد
خورده ساقی می و گردیده جهانی مدهوش
همه محسوس بود ایزد ، و عالم معقول
غالب ، این زمزمه آواز نخواهد ، خاموش !


۱۹۵

نیست معبودش حریفِ تابِ ناز آوردنش
پیشِ آتش دیده ام ، روزی ، نیاز آوردنش

تا خود از بهرِ نثارِ کیست؟ می میرم ز رشک،
خضر و چندین کوشش و عمرِ دراز آوردنش

رحمتِ حق باد برهمدم! که داند، مست مست
بر سرِ نعشم، به تقریبِ نماز آوردنش

۱۹۶

بعرضِ شهرتِ خویش، احتیاجِ ما دارد
چو شعلهٔ که نیاز اوفتد به خار و خسش

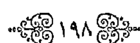
ز رنگ و بوی گل و غنچه، در نظر دارم
غبارِ قافلهٔ عمر و نالهٔ جرسش

خوشم که دوست خود آنمایه بیوفا باشد
که در گمان نسگالم امیدگاهِ کسش

۱۹۷

خوشا حالم! تن آتش، بستر آتش
سپندی کو؟ که افشانم بر آتش

ز رشکِ سینهٔ گرمی که دارم
کشد، از شعله، بر خود خنجر، آتش



دودِ سودائی تتُق بست، آسمان نامیدمش
دیده بر خوابِ پریشان زد، جهان نامیدمش

باد دامن زد بر آتش، نوبهاران خواندمش
داغ گشت آن شعله از مستی، خزان نامیدمش

بود در پهلو به تمکینی که دل می‌گفتمش
رفت از شوخی بآئینی که جان نامیدمش

تا نهم بر وی سپاسِ خدمتی از خویشتن
بود صاحب‌خانه، اما میهمان نامیدمش

بر امیدِ شیوهٔ صبرآزمائی زیستم
تو بُریدی از من و من امتحان نامیدمش

۱۹۹

ز لکنت ، می‌تپد نبضِ رگِ لعلِ گهربارش
شهیدِ انتظارِ جلوهٔ خویشست ، گفتارش

ادای لاابالی شیوه مستی در نظر دارم
سرِ پرشورم ، از آشفتگی ، ماند بدستارش

بتی دارم که ، گوئی ، گر بروی سبزه بخرامد
زمین ، چون طوطیء بسمل ، تپد از ذوقِ رفتارش

وکالت کرد خواهم روزِ محشر کشتگانش را
نباشد ، تا دران هنگامه ، جز با من سروکارش

نه از مهرست کز غالب بمردن نیستی راضی
سرت گردم ! تو میدانی که مردن نیست دشوارش

۲۰۰

من و نظارهٔ روئی که وقتِ جلوه ، از تابش
همی بر خویشتن لرزد ، پسِ آئینه ، سیمابش

بذوقِ باده، داغِ آن حریفِ دوزخ آشامم
که هر جا بنگرد آتش، بگردد در دهن آبش

به فیضِ شرع، بر نفسِ مُزوِّر یافتم دستی
چو آن دزدی که گیرد شحنه ناگاهان بمهتابش

ازین رختِ شراب‌آلوده‌ات ننگ آیدم، غالب
خدا را! یا بشو، یا بفگن اندر راهِ سیلابش

ص

چون عکسِ پل بسیل، بذوقِ بلا برقص
جا را نگاه دار و هم از خود جدا برقص

هم بر نوای چغد، طریقِ سماع گیر
هم در هوای جنبشِ بالِ هما برقص

غالب، بدین نشاط که وابستهٔ کهٔ
بر خویشتن ببال و به بندِ بلا برقص

ض

دل در غمش بسوز، که جان میدهد عوض
ور جان دهی ، غمی به ازان میدهد عوض

از هرچه نقشِ وهم و گمانست ، درگزر
کُو خود ، برون ز وهم و گمان میدهد عوض

پاداشِ هر وفا بجفای دگر کند
غالب، به‌بین که دوست چسان میدهد عوض

ط

گوئی که «هان ! وفا ؛ که وفا بوده است شرط»
آری ، همین ز جانبِ ما بوده است شرط

تا نگزرم ز کعبه ، چه بینم؟ که خود ز دیر
رفتن بکعبه ، رو بقفا بوده است شرط

غالب ، بعالمی که توئی ، خونِ دل بنوش
از بهرِ باده ، برگ و نوا بوده است شرط

۲۰٤

تکیه بر عهدِ زبانِ تو غلط بود، غلط؛
کان خود از طرزِ بیانِ تو غلط بود، غلط

آن که گفت، از منِ دلخسته به پیشِ تو، رقیب
که «غلط بود»، بجانِ تو! غلط بود، غلط

این مسلّم که لبِ هیچ مگوئی داری
خاطرِ هیچ مدانِ تو غلط بود، غلط

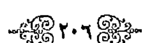
آخر، ای بوقلمون جلوه! کجائی؟ کاینجا
هرچه دادند نشانِ تو، غلط بود، غلط

ظ

مرا که باده ندارم، ز روزگار چه حظ؟
ترا که هست و نیاشامی، از بهار چه حظ؟

خوشست کوثر و پاکست بادهٔ که دروست
از آن رحیقِ مقدس، درین خمار چه حظ؟

بذوقِ بی‌خبر از در در آمدن محوّم
بوعده‌ام چه نیاز و ز انتظار چه حظ ؟



۲۰۶

تا رغبتِ وطن نبود ، از سفر چه حظ ؟
آنرا که نیست خانه به شهر ، از خبر چه حظ ؟

تا فتنه در نظر نه نهی ، از نظر چه سود ؟
تا دشنه بر جگر نخوری ، از جگر چه حظ ؟

باید نبشت نکتهٔ غالب بآبِ زر :
«بی آنکه وجه ِمی شود ، از سیم و زر چه حظ ؟»



ع

جان بناموس دهی چند فراهم شده اند ؛
ورنه خود با تو چه بودست ، رگِ گردنِ شمع ؟

روزم ، از تیرگی ، آن وسوسه ریزد بنظر
که شبِ تار ، به هنگامِ فرومردنِ شمع

۲۰۸

شادم که بر انکارِ من ، شیخ و برهمن گشته جمع
کز اختلافِ کفر و دین ، خود خاطرِ من گشته جمع

ای آنکه بر خاکِ درش تنهای بیجان دیدهٔ !
بر گوشهٔ بامش ، نگر ، جانهای بی تن گشته جمع

صبحست و گوناگون اثر ، غالب ، چه خسپی بیخبر
نیکان به مسجد رفته در ، رندان بگلشن گشته جمع

غ

بخون تپم بسرِ رهگزر ، دروغ ، دروغ !
نشان دهم به رهت صد خطر ، دروغ ، دروغ !

طراوتِ شکنِ جیب و آستینت کو ؟
ز نامه دم مزن ، ای نامه بر! دروغ ، دروغ !

۲۱۰

هنگامِ بوسه ، بر لبِ جانان خورم دریغ
در تشنگی ، به چشمهٔ حیوان خورم دریغ

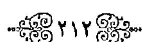
زین دود و زین شراره که در سینهٔ منست
سازم سپهر، گر نه بسامان خورم دریغ

ف

گل و شمعم، بمزارِ شهدا گشت تلف
نشدی راضی و عمرم بدعا گشت تلف

آمدی دیر به پرسش؛ چه نثارت آرم؟
من و عمری که باندوهِ وفا گشت تلف!

گیرم، امروز دهی کامِ دل؛ آن حسن کجا؟
اجرِ ناکامیء سی سالهٔ ما گشت تلف



ای کرده غرقم بیخبر! شو زین نشانها یك طرف
رختم بساحل یك طرف، شستم بدریا یك طرف

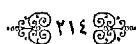
از عشق و حسنِ ما و تو، با همدگر در گفتگو
خسرو به مجنون یك طرف، شیرین به لیلی یك طرف

ای آئینه پیشِ نظر، مستانه بر خود جلوه‌گر!
رحمی بجانِ خویش کن، غمخواریء ما یك طرف!

ق

براهِ شوق، بر آن آب، خون همی گریم
که قطره قطره، چو ابرم، چکیده از ابریق

ترا به پهلوی میخانه جا دهم، غالب
بشرطِ آن که قناعت کنی ببوی رحیق



به بزمِ باده، گریبان کشودنش نگرید
خوشا بهانهٔ مستی! خوشا رعایتِ شوق!

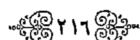
بخود مناز و به آموزگاریم بپزیر
من و نهایتِ عشق و تو و بدایتِ شوق!

ك

مَرد آنکه در هجومِ تمنا شود هلاك
از رشكِ تشنهٔ که بدریا شود هلاك

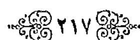
نازم به کشتهٔ که چو یابد دوباره عمر
در عذرِ التفاتِ مسیحا شود هلاك !

با خضر گر نمی روم ، از بیمِ ناکسیست
ترسم ، ز ننگِ همرهیء ما شود هلاك



بحر اگر موجزنست ، از خس و خاشاك چه باك ؟
با تو ، زاندیشه چه اندیشه ، و از باك چه باك ؟

وحشتی نیست ، اگر خانه چراغی دارد
با دل ، از تیرگیء زاویهٔ خاك ، چه باك ؟



سبك روحم ؛ بوَد بارِ من اندك
چرا نشماری آزارِ من اندك ؟

ازین پرسش که بسیارست از تو
شد اندوهِ دلِ زارِ من اندك

مدان کز دست بُردِ تست ، گر هست
متاعِ صبر در بارِ من اندک

وجودم خوانِ یغما بود غم را
تو هم بردی ز بسیارِ من اندک

گ

ای ترا و مرا ، درین نیرنگ
دهن و چشم و دست و دل همه تنگ !

شکوه و شکر ، هرزه و باطل
غالب و دوست ، آبگینه و سنگ

ل

نه مرا دولتِ دنیا ، نه مرا اجرِ جمیل
نه چو نمرود توانا ، نه شکیبا چو خلیل

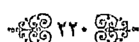
با رقیبان ، کفِ ساقی ، بمیء ناب کریم
با غریبان ، لبِ جیحون ، بدمی آب بخیل

ای به مسمارِ قضا ، دوخته چشمِ ابلیس
بدمِ گرمِ روان ، سوخته بالِ جبریل !

با تو ام ، خرمیء خاطرِ موسی بر طور
با خودم ، خستگیء لشکرِ فرعون به نیل

بر کمالِ تو ، در اندازه ، کمالِ تو محیط
بر وجودِ تو ، در اندیشه ، وجودِ تو دلیل

نه کنی چاره ، لبِ خشکِ مسلمانی را ؟
ای به ترسا بچگان کرده میء ناب سبیل !

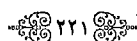


راهیست که در دل فتد ، ار خون رود از دل
ناید بزبان شکوه و بیرون رود از دل

با من سخن از سستیء اوهام سراید
کم خرمیء فالِ همایون رود از دل

شخصش ، بخیالم نزند پایچه بالا
هرچند ، ز جوشِ هوسم ، خون رود از دل

زان شعر که در شکوهٔ خوی تو سرایم
لفظم بزمان ماند و مضمون رود از دل



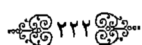
گفتم: «ز شادی، نبودم گنجیدن آسان در بغل»
تنگم کشید، از سادگی، در وصل جانان در بغل!

نازم خطر ورزیدنش، وان هرزه دل لرزیدنش:
چینی بیازی بر جبین، دستی بدستان در بغل!

دانش بمی در باخته، خود را ز من نشناخته
رخ، در کنارم ساخته، از شرم، پنهان در بغل!

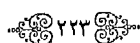
گاهم به پهلو خفته خوش، بستی لب از حرف و سخن
گاهم بیازو مانده سر، سودی زنخدان در بغل!

هان! غالبِ خلوت نشین، بیمی چنان عیشی چنین:
جاسوسِ سلطان در کمین، مطلوبِ سلطان در بغل!



تا گل برنگ و بوی که ماند؟ که در چمن
گل در پسِ گل آمده در جستجوی گل

زانگه که عندلیب لقب دادهٔ مرا
افزودهٔ امیدِ من و آبروی گل



تن بر کرانه ضایع ، دل در میانه غافل
چون غرقهٔ که ماند رختش بسوی ساحل

داغم ، بشعله زائی ، اندازِ برقِ خاطف
سعیم ، بنارسائی ، پروازِ مرغِ بسمل

رازِ تو ، در نهفتن ، تبخاله ریخت بر لب
تیرِ تو ، در گزشتن ، پیکان گداخت در دل

با من ، نموده مجنون بیعت ، به فنِ سودا
بر تو ، فشانده لیلی زیور ، ز طرفِ محمل

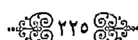
م

رفتم، که کهنگی ز تماشا برافگنم
در بزمِ رنگ و بو، نمطی دیگر افگنم

هنگامه را، جحیمِ جنون بر جگر زنم
اندیشه را، هوای فسون در سر افگنم

نخلم که هم، بجای رطب، طوطی آورم
ابرم که هم، بروی زمین، گوهر افگنم

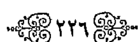
ضعفم، بکعبه مرتبهٔ قربِ خاص داد:
سجاده گستری تو و من بستر افگنم



بسکه به پیچد به خویش، جاده، ز گمراهیم
ره بدرازی دهد، عشوهٔ کوتاهیم

دور فتادم ز یار؛ ماهیء بی دجله ام
نیست دلم در کنار؛ دجلهٔ بی ماهیم

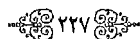
بندهٔ دیوانه ام ، مخطی و ساهی خوشم :
حکمِ ترا مخطیم ، قهرِ ترا ساهیم



۲۲۶

بو ، که به حشو بشنوی قصهٔ ما و مدعی
تازه ز رویدادِ شهر، طرحِ فسانه کرده ایم

باده بوام خورده و زر بقمار باخته
وه ! که ز هرچه ناسزاست ، هم بسزا نه کرده ایم



۲۲۷

معنیء بیگانهٔ خویشم ، تکلف برطرف !
چون مهِ نو ، مصرعِ تاریخِ ایجادِ خودم

گر فراموشی بفریادم رسد ، وقتست ، وقت
رفته‌ام از خویشتن چندانکه در یادِ خودم

می دهم دل را ، ز بیدادت ، فریبِ التفات
سادگی بنگر، که در دامِ تو صیادِ خودم !

۲۲۸

یاد باد آن روزگاری کاعتباری داشتم :
آهِ آتشناك و چشمِ اشکباری داشتم

آفتابِ روزِ رستاخیز یادم میدهد
کاندران عالم، نظر بر تابساری داشتم

تا کدامین جِلوه، زان کافرادا می‌خواستم؟
کز هجومِ شوق، در وصل انتظاری داشتم

خوی تو دانستم؛ اکنون بهرِ من زحمت مکش
رام بودم، تا دلِ امیدواری داشتم

دیگر، از خویشم خبر نبود؛ تکلف برطرف!
این قدر دانم که غالب نام یاری داشتم

۲۲۹

دیدم آن هنگامه؛ بیجا خوفِ محشر داشتم
خود همان شور است، کاندر زیست، در سر داشتم

تا چه سنجم دوزخ و کوثر؟ که من نیز، این چنین
آتشی در سینه و آبی بساغر داشتم

دوش، بر من عرض کردند آنچه در کونین بود
زان همه کالای رنگارنگ، دل برداشتم

کور بودم کز حرم راندند، رفتم سوی دیر
از جمالِ بت سخن می رفت، باور داشتم

۲۳۰

این چه شور است که، از شوقِ تو، در سر دارم؟
دلِ پروانه و تمکینِ سمندر دارم

پرتوِ مهر، سیاهی ز گلیمم نه برد
سایه ام، سایه: شب و روز برابر دارم

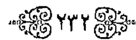
۲۳۱

شبهای غم، که چهره به خوناب شسته ایم
از دیده، نقشِ وسوسهٔ خواب شسته ایم

پیمانه را ز باده ، به خون ، پاك کرده ایم
کاشانه را ز رخت ، به سیلاب ، شسته ایم

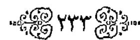
غرقِ محیطِ وحدتِ صرفیم و در نظر
از روی بحر، موجه و گرداب شسته ایم

تردامنی ، نصیبِ کس از اهلِ دین مباد !!
مائیم و لوثِ باده که بی‌آب شسته ایم !



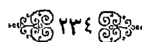
بخت در خوابست ، می‌خواهم که بیدارش کنم
پارهٔ غوغای محشر کو ؟ که در کارش کنم

با تو عرضِ وعده‌ات ، حاشا! که از ابرام نیست
هرچه میگوئی ، همی خواهم که تکرارش کنم



دل با حریف ساخته و ما ، ز سادگی
بر مدعای خویش ، گواهش گرفته ایم

از چشمِ ما ، خیالِ تو بیرون نمی رود
گوئی ، بدامِ تارِ نگاهش گرفته ایم



تا فصلی ، از حقیقتِ اشیا ، نوشته ایم
آفاق را مرادفِ عنقا نوشته ایم

ایمان بغیب ، تفرقها رفت از ضمیر
ز اسما گزشته ایم و مسمّی نوشته ایم

در هیچ نسخه ، معنیء لفظِ امید نیست
فرهنگ نامهای تمنا نوشته ایم

آینده و گزشته ، تمنا و حسرتست
یك «کاشکی» بود ، که بصد جا نوشته ایم

غالب ، الف همان علمِ وحدتِ خودست
بر «لا» چه برفزود ، گر «اِلّا» نوشته ایم ؟

۲۳۵

صبحست ، خیز ، تا نفسی درهم افگنم
از ناله ، لرزه در فلکِ اعظم افگنم

آتش فرونشاند نمِ دامنم ؛ بیا
کاین دلقِ نیم سوخته در زمزم افگنم

خوشنودم از تو و ز پیِ دورباشِ خلق
آوازهٔ جفای تو در عالم افگنم

دوزند گر ، بفرض ، زمین را به آسمان
حاشا ! کزین فشار ، در ابرو خم افگنم

۲۳۶

بی پردگیِ محشرِ رسوائیِ خویشم
در پردهٔ یك خلق ، تماشائیِ خویشم

نقشِ بضمیر آمدهٔ نقش طرازم
حاشا ! که بود دعوی پیدائیِ خویشم

۲۳۷

گم گشته بکوی تو، نه دل، بلکه خبر هم
در لرزه ز خوی تو، نه دم، بلکه اثر هم
یا رب! چه بلائی؟ که دمِ عرضِ تمنا
اجزای نفس می خزد، از بیمِ تو، درهم
تا حسن، به بی پردگیء جلوه، صَلا زد
دیدیم که تاری ز نقابست نظر هم

۲۳۸

رنگها چون شد فراهم، مصرفی دیگر نداشت
خلد را نقش و نگارِ طاقِ نسیان کرده ایم
زاهد، از ما خوشهٔ تاکی، به چشمِ کم مبین
هَی! نمیدانی که یك پیمانه نقصان کرده ایم

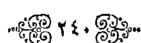
۲۳۹

هم به عالم، ز اهلِ عالم بر کنار افتاده ام
چون امامِ سُبحه، بیرون از شمار افتاده ام

ریزم ، از وصفِ رخت ، گل را شرر در پیرهن
آتشِ رشکم ؛ بجانِ نوبهار افتاده ام

کشتیء بی ناخدایم ؛ سرگزشتِ من مپرس
از شکستِ خویش ، بر دریا کنار افتاده ام

از روانیهای طبعم ، تشنهٔ خونست دهر
آبم ، آب ؛ اما ، تو گوئی ، خوشگوار افتاده ام



سوخت جگر، تا کجا رنجِ چکیدن دهیم؟
رنگ شو ، ای خونِ گرم ! تا پریدن دهیم

جلوه غلط کرده اند ؛ رخ بکشا ، تا ز مهر
ذره و پروانه را ، مژدهٔ دیدن دهیم

دامن ، از آلودگی ، سخت گران گشته است
وه ! که درآرد ز پا ، به ! که بچیدن دهیم

۲٤۱

بود بدگو ساده ، با خود همزبانش کرده ام
از وفا آزردنت ، خاطرنشانش کرده ام
بر امیدِ آنکه اختر در گزر باشد مگر
هرزه میگویم که « بر خود مهربانش کرده ام »
گوشهٔ چشمش ، به بزمِ دلربایان ، با منست
وقتِ من خوش باد ! کز خود بدگمانش کرده ام
در طلب ، دارم تقاضائی که گوئی ، در خیال
بوسه تحویلِ لبِ شکّر فشانش کرده ام

۲٤۲

می ربایم بوسه و عرضِ ندامت می‌کنم
اختراعی چند ، در آدابِ صحبت می‌کنم

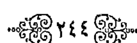
۲٤۳

صبح شد ، خیز ، که رودادِ اثر بنمایم :
چهره ، آغشته بخونابِ جگر ، بنمایم

پنبه یکسو نهم از داغ ، که رخشد چون روز
آخری نیست شبم را که سحر بنمایم

می‌کند ناز ، گمان کرده که خط دیر دمد
خیز ، تا شعبدهٔ جذبِ نظر بنمایم

چون به محشر ، اثرِ سجده ز سیما جویند
داغِ سودای تو ، ناچار ، ز سر بنمایم



گاه ، گاه ، از نظرم مست و غزلخوان بگزر ؛
ورنه بر عهدهٔ من نیست که رسوا باشم

با دلِ چون تو ستم پیشهٔ ، داورنشناس
چکنم ، گر همه اندیشهٔ فردا باشم ؟

همچو آن قطره که بر خاك فشاند ساقی
دورم از کُنجِ لبت ، گر همه صهبا باشم

۲٤٥

دگر، نگاهِ ترا مستِ ناز می‌خواهم
حسابِ فتنه، ز ایام باز می‌خواهم

گزشتم از گله، در وصل فرصتم بادا!
زبانِ کوته و دستِ دراز می‌خواهم

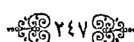
وکیلِ غالبِ خونین‌دلم؛ سفارش نیست
بشکوهٔ تو، زبان را مجاز می‌خواهم

۲٤٦

ز من حذر نه کنی، گر لباسِ دین دارم
نهفته کافرم و بت در آستین دارم

نشسته ام، بگدائی، بشاهراه و هنوز
هزار دزد، بهر گوشه، در کمین دارم

ترا نه گفتم اگر جان و عمر، معذورم؛
که من، وفای تو با خویشتن، یقین دارم



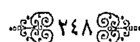
بیا ، که قاعدهٔ آسمان بگردانیم
قضا ، به گردشِ رطلِ گران ، بگردانیم

ز چشم و دل ، به تماشا ، تمتع اندوزیم
ز جان و تن ، به مدارا ، زیان بگردانیم

اگر ز شحنه بود گیرودار ، نندیشیم
وگر ز شاه رسد ارمغان ، بگردانیم

ندیم و مطرب و ساقی ز انجمن رانیم
بکاروبار ، زنی کاردان بگردانیم

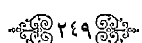
نهیم شرم به یکسوی و باهم آویزیم
بشوخئی که رخِ اختران بگردانیم



رفت بر ما ، آنچه خود ما خواستیم
وایه از سلطان ، بغوغا ، خواستیم

رفت و باز آمد هما ، در دامِ ما
باز سر دادیم و عنقا خواستیم

هم بخواهش ، قطعِ خواهش خواستند
عذرِ خواهشهای بیجا خواستیم



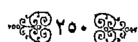
۲٤۹

اگر بر خود نمی بالد ، ز غارت کردنِ هوشم
مر او را ، از چه دشوارست ، گنجیدن در آغوشم؟

نیرزم هیچ : چون لفظِ مکرر ضایعم ، ضایع
مگر کز لك کشد دستِ نوازش بر سر و دوشم

مرنج از وعدهٔ وصلی ، که با من درمیان آری
که خواهد شد ، بذوقِ وعدهٔ دیگر ، فراموشم

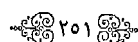
ادای می بساغرکردنت نازم ! زهی ساقی !
بیفشان جرعه بر خاك و ز من بگزر که مدهوشم



وحشتی در سفر، از برگِ سفر، داشته ایم
توشـــهٔ راه، دلی بود که برداشته ایم

تو دماغ، از میء پرزور، رسانیده و ما
بر درِ خمکده، خشتی تهِ سر داشته ایم

وا رسیدیم؛ که، غالب، بمیـان بود نقاب
کاش! دانیم که از روی که برداشته ایم



خواهی فراغِ خویش، بیفزای بر ستم
تا، در عوض، همان قدر از شکوه کم کنم

طفلست و تندخوی: به بینم، چه می کند؟
رامم؛ ولی بعربده، دانسته رم کنم

تا دخلِ من بعشق فزون تر بود ز خرج
خواهم که از تو بیش کشم ناز و کم کنم

۲۵۲

نه از مهرست ، گر بر داستانم می‌نهد گوشی
همان از نکته چینی ، خیزدش ذوقِ شنیدن هم

چه پرسی، کز لبت وقتِ قدح نوشی ، چه می‌خواهم ؟
همین بوسیدنی ؛ چون مست تر گردی ، مکیدن هم !

سرت گردم ! شکارِ تازه گر هردم هوس داری
بپر بندم ، رها میکن بقدرِ یك رمیدن هم

۲۵۳

آنم که لبِ زمزمه فرسای ندارم
در حلقهٔ سوهان نفسان ، جای ندارم

خود رشته زند موجِ گهر؛ گرچه من اکنون
جز رعشه ، بدستِ گهرآمای ندارم

نازِ تو فراوان بود و صبرِ من اندك
تو دست و دلی داری و من پای ندارم



پرسد سببِ بیخودی از مهر و من ، از بیم
در عذر ، بخون غلتم و گفتار ندانم
زخمِ جگرم ؛ بخیه و مرهم نه پسندم
موجِ گهرم ؛ جنبش و رفتار ندانم
غالب ، نبود کوتهی از دوست ، همانا
زانسان دهدم کام که بسیار ندانم



نامه‌بر گم شد ، در آتش نامه را باز افگنم
چون کبوتر نیست ، طاؤسی بپرواز افگنم
ترکِ صحبت کردم و در بندِ تکمیلِ خودم
نغمه ام جان گشت ، خواهم در تنِ ساز افگنم



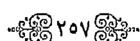
ای ز سازِ زنجیرم ، در جنون نواگر کن !
بند ، گر بدین ذوقست ، پارهٔ گران تر کن

فیضِ عیشِ نوروزی جاودانه خوش باشد
روزِ من ، ز تاریکی ، با شبم برابر کن

«کن» ، بپارسی گفتی ، سازِ مــدعا کردم
هم بخویش ، در تازی ، گفته را مکرر کن

از درون ، روانم را در سپاسِ خویش آور
وز برون ، زبانم را شکوه‌سنجِ اختر کن

بخششِ خــداوندی ، گر فراخورِ ظرفست
هم بهوش بیشی ده ، هم به می تونگر کن



ها ! پری‌شیوه غزالان و ز مردم رمِ شان
دلِ مردم بخمِ طرهٔ خم در خمِ شان

کافرانند جهــان‌جوی ، که هرگز نبود
طرهٔ حور دلاویزتر از پرچمِ شان

رشك بر تشــنهٔ تنهــا روِ وادی دارم
نه بر آسوده دلانِ حرم و زمزمِ شان

۲۵۸

گرفتم، کی بشرعِ ناز، زارم میتوان کشتن؟
به فتوای دلِ امّیدوارم میتوان کشتن

بجرمِ این که در مستی، بپایان برده ام عمری
بکوی می‌فروشان، در خمارم میتوان کشتن

جفا بر چون منی کم کن؛ که گر کشتن هوس باشد
بذوقِ مژدهٔ بوس و کنارم میتوان کشتن

بخونِ من، اگر، ننگست دست و خنجر آلودن
نویدِ وعدهٔ؛ کز انتظارم میتوان کشتن

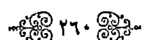
۲۵۹

زهی! باغ و بهارِ جان فشانان
غمت، چشم و چراغِ راز دانان

بصورت، اوستادِ دلفریبان
بمعنی، قبلهٔ نامهربانان

وصالت ، جان توانا سازِ پیران
خیالت ، خاطر آشوبِ جوانان

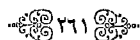
ز ناحق کشتگان راضی ، بجانت !
که غالب هم یکی باشد از آنان



طاق شد طاقت ، ز عشقت برکران خواهم شدن
مهربان شو ؛ ورنه بر خود مهربان خواهم شدن

خار و خس هرگه در آتش سوخت ، آتش می‌شود
مُردم از ذوقِ لبت ، چندان که جان خواهم شدن

بسکه فکرِ معنیء نازك همی کاهد مرا
شاهدِ اندیشه را موی میان خواهم شدن

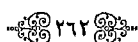


دل ، زان مژهٔ تیز ، بیك بار کشیدن
دامن ، بدرشتی بود از خار کشیدن

دارم سرِ این رشته بدانسان که ز دیرم
تا کعبه، توان برد بزنار کشیدن

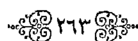
حق گویم و نادان بزبانم دهد آزار
یا رب! چه شد آن فتوی بردار کشیدن؟

من کافرِ زنهاریء شاهم؛ بمن ارزد
می، در رمضان، بر سرِ بازار کشیدن



واعظ، سخن از توبه مگو، اینکه پس از می
دست و دهنی آب کشیدیم، بسست این

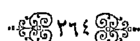
لب بر لبِ دلبر نهم و جان بسپارم
ترکیبِ یکی کردنِ صد ملتمسست، این



بسکه لبریزست، ز اندوهِ تو، سرتاپای من
ناله می روید، چو خارِ ماهی، از اعضای من

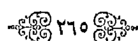
دانمش در انتظارِ غیر و نالم زار، زار
وای من! گر رفته باشد خوابش، از غوغای من

خاطرِ منت پزیر و خوی نازك دادهٔ
گر به بخشی، شرمسارم، ور نه بخشی، وای من!


۲۶۴

خوش بود، فارغ ز بندِ کفر و ایمان زیستن
حیف! کافر مردن و آوخ! مسلمان زیستن

شیوهٔ رندانِ بی پروا خرام از من مپرس
اینقدر دانم که دشوارست آسان زیستن

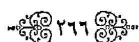

۲۶۵

چیست، به لب خنده، از عتاب، شکستن؟
رونقِ پروین، ز آفتاب، شکستن

شانه بران طرهٔ سیاه کشیدن
قیمتِ کالای مشکناب شکستن

جوششِ سرمستیم ، ز برق پسندد
نیشتر اندر رگِ سحاب شکستن

طره میارا بَرَغمِ خواهشِ غالب
چیست دلش را ، ز پیچ و تاب ، شکستن ؟



خیره کند مرد را مهرِ دِرم داشتن
حیف ! ز همچو خودی ، چشمِ کرم داشتن

وای ! ز دل مردگی ، خوی بد انگیختن
آه ! ز افسردگی ، روی دژم داشتن

بهرِ فریب ، از ریا ، دامِ تواضع مچین ؛
دل نرباید همی تیغ ، ز خم داشتن

اشک چنان بی اثر ، ناله چنین نارسا !
دیده و دل را سزد ماتمِ هم داشتن

۲٦۷

چه غم؟ ار به جِد گرفتی، ز من احتراز کردن
نتوان گرفت از من، بگزشته ناز کردن

نگهت بهوشگافی، ز فریبِ رم نخوردن
نفسم بدام بافی، ز سخن دراز کردن

ز غمِ تو باد شرمم! که چه مایه شوخ چشمیست
ز شکستِ رنگ، بر رخ درِ خلد باز کردن؟

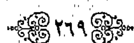
بفشارِ رشکِ بزمت، نه چنان گداخت گلشن
که میانهٔ گل و مل رسد امتیاز کردن

۲٦۸

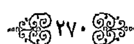
چون شمع، رود شب همه شب دود، ز سرمان
زینگونه، کرا روز بسر رفت، مگر مان؟

آذر به پرستیم و رخ از شعله نتابیم
ای خوانده بسوی خود ازین راهگزر مان!

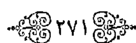
غالب ، چه زیان ؟ ناله اگر گرمروی کرد
سوزی بدل اندر نه و داغی بجگر مان


۲۶۹

خجل ، ز راستیء خویش ، میتوان کردن
ستم بجانِ کج اندیش میتوان کردن
اگر بقدرِ وفا میکنی جفا ، حیفست !
بمرگِ من ! که ازین بیش میتوان کردن


۲۷۰

حیفست ، قتلگه ز گلستان شناختن !
شاخ از خدنگ و غنچه ز پیکان شناختن
لختِ دلم بدامن و چاکِ غمم بجیب
اینك ، سزای جیب ز دامان شناختن !


۲۷۱

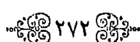
بخونم دست و تیغ آلود جانان
بد آموزان ، وکیلِ بی زبانان

چگویم در سپاسِ بی‌کسیها ؟
زهی ! نا مهربانانِ مهربانان

فغانا ! مَیگساران دجله نوشان
دریغا ! ساقیان اندازه دانان

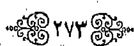
گلی بر گوشهٔ دستار داری
خوشا ! بختِ بلندِ باغبانان !!

گزشت از دل ، ولی نگزشت از دل
خدنگِ غمزهٔ زورین کمانان


۲۷۲

تا ز دیوانم ، که سرمستِ سخن خواهد شدن ؟
این می ، از قحطِ خریداری ، کهن خواهد شدن

کوکبم را ، در عدم ، اوجِ قبولی بوده است
شهرتِ شعرم ، به گیتی ، بعدِ من خواهد شدن



سرشک افشانیء چشم ترش بین
شهِ خوبان و گنجِ گوهرش بین

ادای دلستانی رفته از یاد
هوای جانفشانی در سرش بین

بدشت آورده رو سیلست ، گوئی
روا رو در گدایانِ درش بین

صفای تن فزون تر کرده رسوا
دل ، از اندیشه ، لرزان در برش بین

مهِ نو کرده ، کاهش ، پیکرش را
بچشمِ کم ، همان مه پیکرش بین

خداوندش بخونِ ما مگیراد !
به بیتابی ، نگه بر خنجرش بین



حق که حقّست ، سمیعست ، فلانی ! بشنو
بشنو ، گر تو خداوندِ جهانی ، بشنو

«لن ترانی» بجوابِ «آرِنی» چند و چرا؟
من نه اینم ، بشناس و تو نه آنی ، بشنو

سوی خود خوان و بخلوتگهِ خاصم جا ده
آنچه دانی ، بشمار؛ آنچه ندانی ، بشنو

پردهٔ چند ، بآهنگِ نکیسا ، بسرای
غزلی چند ، بهنجارِ فغانی ، بشنو

زینکه دیدی بجحیم ، طلبِ رحم خطاست
سخنی چند ز غمهای نهانی بشنو

نامه در نیمهٔ ره بود که غالب جان داد
ورق از هم در و این مژده زبانی بشنو

۲۷۵

نمِ اشکی ، چو بخاکم بفشانی ، از مهر
خاك بالد بخود و مهرگیا خیزد ازو

نجهد زیرِ سرانگشتِ تو نبضم ؛ که مرا
نیست دردی که تمنای دوا خیزد ازو

۲۷۶

گوئی بمن : «کسی که ز دشمن رسیده ، کو؟»
آن پیر زالِ سست پیء ، قدخمیده ، کو؟

یادت نکرده خصم ، بعنوان ، بلفظِ دوست
آن نامهٔ نخوانده ، ز صد جا دریده ، کو؟

گوئی : «بشحنه گوی که کس را نکشته ایم»
آن نعشِ نیم سوخته ، ز آتش کشیده ، کو؟

گوئی : «خمش شوی ، چو ز کویم بدر روی»
آن دل که جز بناله بهیچ آرمیده ، کو؟

گوئی : «دمی ز گریهٔ خونین بما برآر»
آن مایه خون که سر دهم از دل بدیده ، کو؟

۲۷۷

بالم بخویش بسکه ، به بندِ کمندِ تو
مَردم گمان کنند که تنگم به بندِ تو

در رهگزر ، به پرسشِ ما گر کَشی ، چه باك ؟
آخر ، شراب نیست عنانِ سمندِ تو

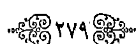
۲۷۸

گستاخ گشته ایم ، غرورِ جمالِ کو ؟
پیچیده ایم سر ز وفا ، گوشمال کو ؟

تا کی فریبِ حلم ؟ خدا را ! خدا نهٔ
آن خوی خشمگین و ادای ملال کو ؟

داغم ز رشكِ شوکتِ صنعان ؛ ولی چه سود؟
آن دستگاهِ طاعتِ هفتاد سال کو ؟

در بادهٔ طهور، غمِ محتسب کجا ؟
در عیشِ خلد، لذتِ بیمِ زوال کو ؟



دولت بغلط نبود، از سعی پشیمان شو
کافر نتوانی شد، ناچار مسلمان شو

از هرزه روان گشتن، قلزم نتوان گشتن
جوئی، بخیابان رو؛ سیلی، به بیابان شو

آوازهٔ معنی را بر سازِ دبستان زن
هنگامهٔ صورت را بازیچهٔ طفلان شو

گر چرخِ فلك گردی، سر بر خطِ فرمان نه
ور گوی زمین باشی، وقفِ خمِ چوگان شو

در بندِ شکیبائی، مُردم ز جگرخائی
ای حوصله! تنگی کن، ای غصه! فراوان شو

سرمایه کرامت کن، وانگاه بغارت بر
بر خرمنِ ما برقی، بر مزرعه باران شو

جان داد بغم غالب؛ خوشنودیء روحش را
در بزمِ عزا می کش، در نوحه غزلخوان شو

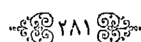


میرود، خنده بسامانِ بهاران زدهٔ
خونِ گل ریخته و می بگلستان زدهٔ

شورِ سودای تو نازم! که بگل می بخشد
چاکی از پردهٔ دل، سر بگریبان زدهٔ

خوشنوا بلبلِ پروانه نژادی دارم
شعله در خویش، ز گلبانگِ پریشان، زدهٔ

خاك در چشمِ هوس ریز؛ چه جوئی از دهر:
بارگاهی بفرازِ سرِ کیوان زدهٔ



بتی دارم، از اهلِ دل رم گرفته
بشوخی، دل از خویشتن هم گرفته

ز سفالك گفتن ، چو گل ، برشگفته
درین شیوه ، خود را مسلّم گرفته

به بیداد ، صد کشته برهم نهاده
ببازیچه ، صد گونه ماتم گرفته

برویش ، ز گرمی ، نگه تاب خورده
بکویش ، برفتن ، صبا دم گرفته

۲۸۲

گاهی بچشمِ دشمن و گاهی در آئنه
پرکارِ عیب جوئیء خویشم ، هر آئنه

حیرت ، نصیبِ دیده ز بیتابیء دلست
سیماب را حقیست ، همانا ، بر آئنه

دورت ربوده ناز ؛ بخود هم نمی رسی
تا چند در هوای تو ریزد پر ، آئنه

۲۸۳

شاها! به بزمِ جشن، چو شاهان، شراب خواه
زر بیحساب بخش و قدح بیحساب خواه

بزمت بهشت و باده حلالست در بهشت
گر بازپرس رو دهد، از من جواب خواه

هرچند، خواستن نه سزاوارِ شانِ تست
قوّت ز طالع و نظر از آفتاب خواه

۲۸٤

دارم دلی، ز غصه گرانبار بودهٔ
بر خویشتن، ز آبله، چیزی فزودهٔ

از بهرِ خویش ننگم و دارم ز بخت، چشم
خود را در آب و آئنه رخ نا نمودهٔ

گمنام و زهد کیشم و خواهم بمن رسد
در رختِ خوابِ شاه، بمستی غنودهٔ

خجلت نگر که در حَسَناتم نیافتند
جز روزهٔ درستِ بصهبا کشودهٔ

۲۸۵

چون زبانها لال و جانها پر ز غوغا کردهٔ
بایدت از خویش پرسید ، آنچه با ما کردهٔ
دجله می‌جوشد ؛ همانا ، دیده‌ها جویای تست !
شعله می بالد ؛ مگر در سینه‌ها جا کردهٔ !

۲۸۶

دانستهٔ که عاشقِ زارم ، گدا نیَم
دانم که شاهدی ، شهِ گیتی ستان نهٔ
نازم تلوّنِ تو ، به بختِ خود و رقیب !
با او چنین نبودی و با ما چنان نهٔ

۲۸۷

مر ، ز فنا ، فراغ را مژدهٔ برگ و ساز ده
سایه به مهر واگزار ، قطره به بحر باز ده

طرهٔ جیب را ، ز چاك ، شانهٔ التفات کش
عارضِ خویش را ، ز اشك ، غازهٔ امتیاز ده

از نمِ دیده ، دیده را رونقِ جویبار بخش
وز تفِ ناله ، ناله را چاشنیِ گداز ده

گر بغمی که خورده‌ام، رخصتِ اشك و آه نیست
هم به دلی که بردهٔ ، طاقتِ ضبطِ راز ده



۲۸۸

بر دست و پای ، بندِ گرانی نهادهٔ
نازم به بندگی ! که نشانی نهادهٔ

تا در امید ، عمر به پندار بگذرد
از لطف ، در حیات ، نشانی نهادهٔ

تا خستهٔ بلا نبود بی گریزگاه
در مرگ ، احتمالِ امانی نهادهٔ

بر هر دلی ، فسونِ نشاطی دمیدهٔ
بر هر تنی ، سپاسِ روانی نهادهٔ

غالب ز غصه مرد ؛ همانا ، خبر نداشت
کاندر خرابه ، گنجِ نهانی نهادهٔ

ی

بگوشم می رسد ، از دور ، آوازِ دِرا امشب
دلی گم گشتهٔ دارم که در صحراست ، پنداری

گرستیم آنقدر کز خون ، بیابان لاله زاری شد
خزانِ ما ، بهارِ دامنِ صحراست ، پنداری

نویدِ وعدهٔ قتلی بگوشم می رسد ، غالب
لبِ لعلش بکامِ بیدلان گویاست ، پنداری

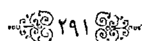
۲۹۰

گر نه نواها سرودمی ، چه غمستی ؟
من که نیَم ، گر نبود می چه غمستی ؟

بختِ خود ار بودمی ، که تا بقیامت
بیخبر از خود غنودمی ، چه غمستی ؟

حیف ! ز عیسی که دور رفت ، وگرنه
معجزهٔ دم نمودمی ، چه غمستی ؟

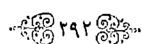
آه ! ز داؤد کان نماند ، وگرنه
ناله به لحن آزمودمی ، چه غمستی ؟



در بستنِ تمثالِ تو ، حیرت رقمستی
بینش ، که به پرکارکشائی علمستی

غم را به تنومندیء سهراب گرفتم ؛
خود موجِ می ، از دشنهٔ رستم چه کمستی ؟

گفتن ز میان رفته و دانم که ندانی
با من که بمرگم ، ز تو پرسش ستمستی



ای به صدمهٔ آهی ، بر دلت ز ما باری !
اینقدر گران نبود نالهٔ ز بیماری

ای فنا ! دری بکشا ؛ بوُ که در تو بگریزد
هم ز خلق نومیدی ، هم ز خویش بیزاری !

-- ۲۹۳ --

بدین خوبی ، خرد گوید که «کامِ دل مخواه از وی»
نکو روی و نکوکار و نکونامست ، آه ! از وی

نگارم ساده و من رندِ رنگ‌آمیزِ رسوایم
چه نقشِ مدعا بندم ، بدین روی سیاه ، از وی؟

جنونِ رشک را نازم ! که چون قاصد روان گردد
دَوَم بیخویش و گیرم نامه ، اندر نیمه راه ، از وی

ز هم دوریم با این مایه نسبت ؛ نامرادی بین !
شبِ تاریك از ما باشد و روی چو ماه از وی

نگاهش شرمگین باشد ، چو مژگان سرکشست؛ آری!
فروماند سپه داری که برگردد سپاه از وی

به غالب آشتی کردیم ؛ دیگر داوری نبود
گزافِ دایمی از ما ، شرابِ گاه‌گاه از وی

۲۹٤

نخواهم از صفِ حوران ، ز صد هزار ، یکی
مرا بسست ، ز خوبانِ روزگار ، یکی

سراغِ وحدتِ ذاتش توان ، ز کثرت ، جُست ؛
که سایرست در اعدادِ بی شمار ، یکی

مرو ز آئنه خانه که خوش تماشائیست :
یکی تو محوِ خودی و چو تو هزار یکی

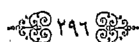
۲۹٥

اندوهِ پرافشانی ، از چهره عیانستی
خون ناشده رنگ ، اکنون ، از دیده روانستی

ذوقِ دلِ خودکامش ، دریاب ز فرجامش
هر حلقهٔ گلدامش ، چشمی نگرانستی

رازِ تو ، شهیدان را در سینه ، نمی‌گنجد
هر سبزه ، درین مشهد ، مانا بزبانستی

ساقی ! بزر افشانی ، دانم ز کریمانی
پیمانه گران‌تر ده ، گر باده گرانستی
فیضِ ازلی نبود مخصوص گروهی را
حرفیست که « می خوردن آئینِ مغانستی »



تابم ز دل برد کافر ادائی
بالا بلندی ، کوته قبائی

در دیرگیری ، غافل نوازی
در زود میری ، عاشق ستائی

در کام بخشی ، ممسك امیری
در دلستانی ، مُبرِم گدائی

گستاخ سازی ، پوزش پسندی
طاقت گدازی ، صبرآزمائی

در عرضِ دعوی ، لیلی نکوهی
بر رغمِ غالب ، مجنون ستائی

۲۹۷

بدل ، ز عربده ، جائی که داشتی ، داری
شمارِ عهدِ وفائی که داشتی ، داری

تو کی ز جور پشیمان شدی ؟ چه میگوئی ؟
دروغِ راست نمائی که داشتی ، داری

عتاب و مهرِ تو از هم شناختن نتوان
خرد فریب ادائی که داشتی ، داری

بگردگار نگرویدی و همان بفسوس
حدیثِ روزِ جزائی که داشتی ، داری

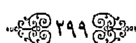
۲۹۸

اگر بشرع ، سخن در بیان بگردانی
ز سوی کعبه ، رخِ کاروان بگردانی

به نیم ناز ، که طرحِ جهانِ نو فگنی
زمین بگستری و آسمان بگردانی

به بیمِ خوی خودم ، در عدم بخوابانی
بذوقِ روی خودم ، در جهان بگردانی

به بذله ، خاطرِ اسلامیان بیازاری
بجلوه ، قبلهٔ زردشتیان بگردانی

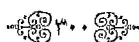


ای موجِ گل ! نویدِ تماشای کیستی ؟
انگارهٔ مثالِ سراپای کیستی ؟

خون گشتم از تو ؛ باغ و بهارِ که بودهٔ ؟
کشتی مرا بغمزه ؛ مسیحای کیستی ؟

از خاکِ غرقهٔ کفِ خونی دمیدهٔ ؟
ای داغِ لاله ! نقشِ سویدای کیستی ؟

با هیچ کافر ، این همه سختی نمی رود
ای شب ! بمرگِ من ! که تو فردای کیستی ؟

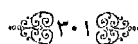


۳۰۰

از کنارِ دجله، آتش‌خانه چندان دور نیست
کشتیِ ما بر شکستن زد، دَرَستان یارئی!

شاد باش! ای غم، ز بیمِ مرگم ایمن ساختی
گشت صرفِ زندگانی، بود گر دشوارئی

با خرد گفتم: «چه باشد مرگ بعد از زندگی؟»
گفت: «هی! خوابِ گرانی از پسِ بیدارئی»



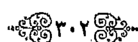
۳۰۱

رفت آنکه کسبِ بوی تو از باد کردمی!
گل دیدمی و روی ترا یاد کردمی!

رفت آنکه گر براهِ تو جان دادمی، ز ذوق
از موجِ گردِ ره، نفس ایجاد کردمی!

اکنون، خود از وفای تو، آزار می‌کشم
رفت آنکه از جفای تو فریاد کردمی!

غالب ، هوای کعبه بسر جا گرفته است
رفت آنکه عزمِ خَلُّخ و نَوشاد کردمی !

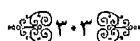


بسکه همواره دلاویزی و شیرین حرکات
سایهٔ طوبی و جوی عسلی را مانی

به توانائیء کوشش ، نتوان یافت ترا
سرخوشیهای قبولِ ازلی را مانی

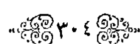
بدلِ هرکه بچشمِ تو درآید ناگاه
داری آنمایه تصرف که ولی را مانی

ای که در طالعِ ما نقشِ تو هرگز ننشست !
زهرهٔ حوتی و شمسِ حملی را مانی



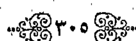
ای که گفتم : « ندهی دادِ دل » آری ، ندهی
تا چو من ، دل به مغان شیوه نگاری ندهی

ماه و خرشید درین دایره بیکار نیند
تو که باشی ، که بخود زحمتِ کاری ندهی ؟
پای را ، خضرِ قدم‌سنجیِ کوئی نشوی
دوش را ، قدرِ گران سنگیِ باری ندهی
سر ، براهِ دمِ شمشیرِ جوانی نه نهی
تن ، به بندِ خمِ فتراکِ سواری ندهی
سینه را ، خستهٔ اندازِ فغانی نه کنی
دیده را ، مالشِ بیدادِ غباری ندهی
حیف ! گر تن به سگانِ سرِ کوئی نرسد
وای ! گر جان به سرِ راهگزاری ندهی



همنشین ، جانِ من و جانِ تو این انگیز ، هی !
سینهٔ از ذوقِ آزارِ منش لبریز ، هی !
بر سرِ کوی تو بیخود گشتنم ، از ضعف نیست
کشتهٔ رشکم ، نیارم دید خود را نیز ، هی !

تیشه را نازم! که بر فرهاد آسان کرد مرگ
خنجرِ شیرُویه و جان دادنِ پرویز، هی!

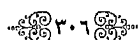


خوشنود شوی، چون دلِ خوشنود نیابی
ترسم که زیان کارکسی، سود نیابی

از قافلۀ گرم روانِ تو نباشد
رختی که، به سیلش، شرراندود نیابی

بر ذوقِ خداداد، نظردوختگانیم
در سینۀ ما، زخمِ نمك سود نیابی

در وجد، بهنجارِ نفس دست فشانیم
در حلقۀ ما، رقصِ دف و عود نیابی



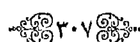
سرچشمۀ خونست، ز دل تا بزبان، های!
دارم سخنی با تو و گفتن نتوان، های!

سیرم نتوان کرد ، ز دیدارِ نکویان
نظّاره بود شبنم و دل ریگِ روان ، های !

ذوقیست درین مویه که بر نعشِ منستش
ها ! دلشدهٔ ، هیچ مگوی ، همه دان ، های !

از جنت و سرچشمهٔ کوثر چه کشاید ؟
خون گشته دل و دیدهٔ خونابه فشان ، های !

غالب ، بدل آویز ؛ که در کارگهِ شوق
نقشیست درین پرده ، بصد پرده نهان ، های !



زاهد که و مسجد چه و محراب کجائی ؟
عیدست و دمِ صبح ؛ میء ناب ! کجائی ؟

بوی گل و شبنم نسزد کُلبهٔ ما را
صرصر ! تو کجا رفتی و سیلاب ! کجائی ؟

۳۰۸

دل، که از من مر ترا، فرجام، ننگ آرد همی
بر سرِ راهِ تو، با خویشم بجنگ آرد همی

پنجهٔ نازك ادایش را نگاری دیگرست
خون کند دل را نخست، آنگه بچنگ آرد همی

بوسه گر خواهی بدین شنگی، به پیچد تنگ تنگ
عذر اگر باید بمستی، رنگ رنگ آرد همی

همچنان در بندِ سامانِ مرادش سنجمی
گر، بجای شیشه، بخت از دوست سنگ آرد همی

۳۰۹

دیده ور آنکه تا نهد دل بشمارِ دلبری
در دلِ سنگ بنگرد، رقصِ بتانِ آزری

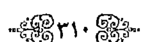
فیضِ نتیجهٔ ورع، از می و نغمه یافتیم
زهرهٔ ما، برین اُفُق، داده فروغِ مشتری

ای تو که هیچ ذره را ، جز برهِ تو، روی نیست !
در طلبت ، توان گرفت بادیه را برهبری

هر که دلست در برش ، داغِ تو رویدش ز دل
تا چو بدیگری دهد ، باز بری بداوری

رشکِ ملك چه و چرا ، چون بتو ره نمی برد ؟
بیهده ، در هوای تو می‌پرد ، از سبك سری

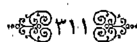
حیف ! که من بخون تپم وز تو سخن رود که تو
اشك بدیده بشمری ، ناله بسینه بنگری



امیدگاهِ من و همچو من هزار ، یکیست
ز رشك ، در صددِ ترکِ مدعاستمی

سخن ز دشمن و غمهای ناگوارش نیست
ز دوست ، داغِ ستمهای نارواستمی

دیت مگوی و ملامت مسنج و فتنه مگیر
چه شد ، که هیچ کسم ؟ بندهٔ خداستمی



بهارم دیدن و رازم شنیدن بر نمی‌تابد
نگه تا دیده خونستی ، و دل تا زهره آبستی !

هجومِ جلوهٔ گل ، کاروانم را غبارستی
طلوعِ نشاهٔ می ، مشرقم را آفتابستی

فغانم را ، نوای صورِ محشر همعنانستی
بیانم را ، رواجِ شورِ طوفان در رکابستی

دلم ، صبحِ شبِ وصلِ تو ، بر کاشانه می‌لرزد
در و بامم بوجد ، از ذوقِ بوی رختِ خوابستی

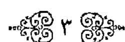


رُباعیّات

ای داده بباد عمر، در لهو و فُسوس!
زنهار! مشو ز رحمتِ حق مایوس
هشدار! کز آتشِ جهنم حق را
تهذیب غرض بود، نه تعذیبِ نفوس



غالب، بگهر، ز دودهٔ زادشمم
زان رو، به صفائی، دمِ تیغست دمم
چون رفت سپهبدی، زدم چنگ به شعر
شد تیرِ شکستهٔ نیاگان قلمم



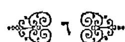
هرچند که زشت و ناسزائیم همه
در عهدهٔ رحمتِ خدائیم همه
ور جلوه دهد، چنانکه مائیم همه
شایستهٔ نفت و بوریائیم همه



آن مرد که زن گرفت، دانا نبود
از غصه فراغتش، همانا، نبود
دارد بجهان خانه و زن نیست درو
نازم بخدا! چرا توانا نبود؟



آن خسته که در نظر بجز یارش نیست
با سود و زیانِ خویشتن، کارش نیست
طالب، ز طلب، رهینِ آثارش نیست
هرچند حنا برگ دهد، بارش نیست



در سینه، ز غم، زخمِ سنانی دارم
چشم و دلِ خونابه فشانی دارم
دانی که مرا چون تو نمی باید هیچ؟
ای فارغ ازان که جسم و جانی دارم!

۷

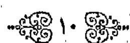
ای آنکه ترا سعی بدرمانِ منست!
مَنعَم مکن از باده؛ که نقصانِ منست
حیفست! که بعدِ من بمیراث رود
این یك دو سه خم که در شبستانِ منست

۸

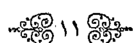
او راست، اگر هزار چیزم بخشند
او راست، اگر بهشت نیزم بخشند
بر دوست فدا کنم، بصد گونه نشاط
جانی که بروزِ رستخیزم بخشند

۹

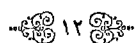
آنم که به پیمانهٔ من، ساقیء دهر
ریزد همه دُردِ دَرد و تلخابهٔ زهر
بگذر ز سعادت و نحوست؛ که مرا
ناهید بغمزه کشت، و مریخ به قهر


۱۰

یا رب! بجهانیان دلِ خرم ده
در دعویء جنّت، آشتی باهم ده
شدّاد پسر نداشت، باغش از تست
آن مسکنِ آدم به بنی‌آدم ده


۱۱

هرکس، ز حقیقت خبری داشته است
بر خاکِ رهِ عجز، سری داشته است
زاهد، ز خدا، ارم بدعوی طلبد
شدّاد، همانا، پسری داشته است


۱۲

ای آنکه دهی مایه کم و خواهش بیش!
آنروز که وقتِ بازپرس آید پیش
بگزار مرا؛ که من خیالی دارم
با حسرتِ عیشهای ناکردهٔ خویش

۱۳

در عالمِ بی زری ، که تلخست حیات
طاعت نتوان کرد ، بامیدِ نجات
ای کاش! ز حق اشارتِ صوم و صلوات
بودی بوجودِ مال ، چون حج و زکوات

۱٤

دستم بکلیدِ مخزنی می‌بایست
ور بود تهی ، بدامنی می‌بایست
یا هیچگهم به کس نیفتادی کار
یا خود بزمانه ، چون منی می‌بایست

۱۵

هستم ز میء امید سرمست و بسست
دارم سرِ این کلاوه در دست و بسست
گر ارزشِ لطف و کرمی نیست ، مباش
استحقاقِ ترحمی هست و بسست

۱۶

بر قولِ تو، اعتماد نتوان کردن
خود را، بگزاف، شاد نتوان کردن
از کثرتِ وعده های پی در پیء تو
یك وعده درست یاد نتوان کردن

۱۷

ای کرده به آرایشِ گفتار بسیچ!
در زلفِ سخن، کشوده راهِ خم و پیچ!
عالم، که تو چیزِ دیگرش میدانی،
ذاتیست بسیطِ مُنْبَسِط، دیگر هیچ

۱۸

دارم دلِ شاد و دیدهٔ بینائی
وز کَرّیء، گوشم، نبود پروائی
خوبست که نشنوم ز هر خود رائی
گلبانگِ «اَنَا رَبُّکُمُ الْاَعْلَائی»

انتخاب غالب

اُردو

کھلتا کسی پہ کیوں ، مرے دِل کا معاملہ ؟

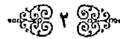
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے !!

غزلیّات

الف

جذبۂ بے اختیارِ شوق دیکھا چاہیے!
سینۂ شمشیر سے باہر ہے، دم شمشیر کا

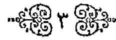
بسکہ ہوں، غالب، اسیری میں بھی آتش زیرِ پا
موی آتش دیدہ ہے، حلقہ مری زنجیر کا



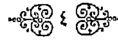
کہتے ہو: «ندیں گے ہم، دل اگر پڑا پایا»
دل کہاں کہ گم کیجے؟ ہم نے مدعا پایا

عشق سے، طبیعت نے زیست کا مزا پایا
درد کی دوا پائی، دردِ بے دوا پایا

دوستدارِ دشمن ہے؛ اعتمادِ دل معلوم!
آہ بے اثر دیکھی، نالہ نارسا پایا



میں عدم سے بھی پرے ہوں؛ ورنہ، غافل! بارہا
میری آہِ آتشیں سے بالِ عنقا جل گیا



بوی گل، نالۂ دل، دودِ چراغِ محفل
جو تری بزم سے نکلا، سو پریشاں نکلا

دلِ حسرت زدہ، تھا مایدۂ لذتِ درد
کام یاروں کا، بقدرِ لب و دنداں، نکلا

تھی نوآموزِ فنا، ہمتِ دشوار پسند
سخت مشکل ہے کہ یہ کام بھی آساں نکلا!

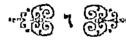
دل میں، پھر گریہ نے اك شور اٹھایا، غالب
آہ! جو قطرہ نہ نکلا تھا، سو طوفاں نکلا



دهر میں ، نقشِ وفا وجـهِ تسلّی نہوا
هے یه وہ لفظ که شرمندۂ معنیِ نہوا

سبزۂ خط سے ، ترا کاکلِ سرکش نه دبا
یه زمرد بهی ، حریفِ دمِ افعیِ نہوا

میں نے چاها تها که اندوهِ وفا سے چهوٹوں
وه ستمگر ، مرے مرنے په بهی ، راضی نہوا



ستایش گر هے ، زاهد اسقدر ، جس باغِ رضواں کا
وه اك گلدسته هے ، هم بیخودوں کی طاقِ نسیاں کا

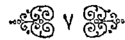
بیاں کیا کیجیے ، بیدادِ کاوشهاے مژگاں کا !
که هر یك قطرۂ خوں ، دانه هے تسبیحِ مرجاں کا

نه آئی سطوتِ قاتل بهی ، مانع میرے نالوں کو
لیا دانتوں میں جو تنکا ، هوا ریشه نیستاں کا

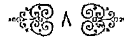
اُگا ہے گھر میں ہر سو سبزہ ؛ ویرانی تماشا کر !
مدار، اب کھودنے پر گھاس کے ہے ، میرے درباں کا

ہنوز، اك پرتوِ نقشِ خیالِ یار باقی ہے !
دلِ افسردہ ، گویا ، حجرہ ہے ، یوسف کے زندان کا

بغل میں غیر کی ، آج آپ سوتے ہیں کہیں ؛ ورنہ
سبب کیا ، خواب میں آ کر ، تبسمہاے پنہاں کا ؟



محبت تھی چمن سے ؛ لیکن اب یہ بیدماغی ہے
کہ موجِ بوے گل سے ، ناك میں آتا ہے دم میرا

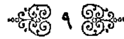


مَحرم نہیں ہے تو ہی ، نواہاے راز کا
یاں ورنہ جو حجاب ہے، پردہ ہے ساز کا !

رنگِ شکستہ ، صبحِ بہارِ نظارہ ہے
یہ وقت ہے ، شگفتنِ گلہاے ناز کا !

تو اور سوے غیر نظرہاے تیز تیز!
میں اور دکھ تری مژہ ہاے دراز کا!

ہیں، بسکہ جوشِ بادہ سے، شیشے اُچھل رہے
ہر گوشۂ بساط، ہے سر شیشہ باز کا



شب ہوئی، پھر انجمِ رخشندہ کا منظر کھلا
اس تکلف سے کہ، گویا، بتکدے کا در کھلا

گرچہ ہوں دیوانہ، پر کیوں دوست کا کھاؤں فریب؟
آستیں میں دشنہ پنہاں، ہاتھ میں نِشتر کھلا

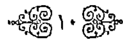
گو نہ سمجھوں اُسکی باتیں، گو نہ پاؤں اُسکا بھید
پر یہ کیا کم ہے کہ مجھ سے وہ پری پیکر کھلا!

ہے، خیالِ حسن میں، حسنِ عمل کا سا خیال
خلد کا اك در ہے، میری گور کے اندر، کھلا

منہ نہ کھلنے پر، ہے وہ عالم کہ دیکھا ہی نہیں!
زلف سے بڑھکر، نِقاب اُس شوخ کے منہ پر، کھلا

کیا رهوں غربت میں خوش؟ جب هو حوادث کا یه حال
نامه لاتا هے وطن سے ، نامــه بر اکثر کهلا

اُسکی امت میں هوں میں، میرے رهیں کیوں کام بند؟
واسطے جس شه کے ، غالب ، گنبدِ بے در کهلا



شب که برقِ سوزِ دل سے ، زَهرهٔ ابر آب تها
شعلهٔ جواله ، هر یك حلقهٔ گرداب ، تها !

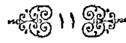
نالهٔ دل میں شب ، اندازِ اثر نایاب تها
تها سپندِ بزمِ وصلِ غیر ، گو بیتاب تها

مقدمِ سیلاب سے ، دل کیا نشاط آهنگ هے !
خانهٔ عاشق ، مگر، سازِ صدای آب تها

آج کیوں پروا نہیں اپنے اسیروں کی تجھے ؟
کل تلك ، تیرا بهی دل مهر و وفا کا باب تها

یاد کر وه دن که هر یك حلقه تیرے دام کا
انتظارِ صید میں ، اك دیدهٔ بیخواب تها

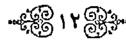
میں نے روکا رات غالب کو، وگرنہ دیکھتے
اسکے سیلِ گریہ میں، گردوں کفِ سیلاب تھا



ایک ایک قطرہ کا مجھے، دینا پڑا، حساب
خونِ جگر، ودیعتِ مژگانِ یار تھا

گلیوں میں میری نعش کو کھینچے پھرو؛ کہ میں
جاندادۂ ہوائے سرِ رہگزار تھا

کم جانتے تھے ہم بھی غمِ عشق کو، پر اب
دیکھا، تو کم ہوئے پہ، غمِ روزگار تھا



بسکہ دشوار ہے، ہر کام کا آساں ہونا
آدمی کو بھی میسّر نہیں، انساں ہونا!

گریہ، چاہے ہے خرابی مرے کاشانے کی
در و دیوار سے ٹپکے ہے، بیاباں ہونا

کی ، مرے قتل کے بعد ، اُسنے جفا سے توبہ
ھائے ! اُس زود پشیماں کا پشیماں ہونا

حیف ! اُس چار گرہ کپڑے کی قسمت ، غالب
جس کی قسمت میں ہو ، عاشق کا گریباں ہونا

۱۳

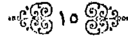
نالۂ دل نے دیے ، اوراقِ لختِ دل ، بباد
یادگارِ نالہ ، اك دیوانِ بے شیرازہ تھا

١٤

دوست ، غمخواری میں میری ، سعی فرماویں گے کیا ؟
زخم کے بھرتے تلك ، ناخن نہ بڑھ جاویں گے کیا ؟

بےنیازی حد سے گزری ؛ بندہ پرور ! کب تلك
ھم کہیں گے حالِ دل اور آپ فرماویں گے : « کیا ؟ »

حضرتِ ناصح گر آویں ، دیدہ و دل فرشِ راہ !
کوئی مجکو یہ تو سمجھادو کہ سمجھاویں گے کیا ؟



یه نہ تھی ہماری قسمت کہ وصالِ یار ہوتا!
اگر اور جیتے رہتے، یہی انتظار ہوتا

ترے وعدہ پر جیے ہم، تو یہ جان، جھوٹ جانا
کہ خوشی سے مر نہ جاتے، اگر اعتبار ہوتا

تری نازکی سے جانا کہ بندھا تھا عہد بُودا
کبھی تو نہ توڑ سکتا، اگر استوار ہوتا

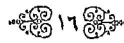
کوئی میرے دل سے پوچھے، ترے تیرِ نیم کش کو!
یہ خلش کہاں سے ہوتی، جو جگر کے پار ہوتا؟

غم اگرچہ جاں گسل ہے، پہ کہاں بچیں؟ کہ دل ہے:
غمِ عشق گر نہوتا، غمِ روزگار ہوتا

کہوں کس سے میں کہ کیا ہے؟ شبِ غم بری بلا ہے
مجھے کیا بُرا تھا مرنا، اگر ایک بار ہوتا؟

اسے کون دیکھ سکتا؟ کہ یگانہ ہے وہ یکتا
جو دوئی کی بو بھی ہوتی، تو کہیں دوچار ہوتا

یہ مسایلِ تصوف، یہ ترا بیان، غالب!
تجھے ہم ولی سمجھتے، جو نہ بادہ‌خوار ہوتا



هوس کو هے نشاطِ کار کیا، کیا!
نہو مرنا، تو جینے کا مزا کیا؟

تجاهل پیشگی سے مدعا کیا؟
کہاں تك، اے سراپا ناز! «کیا، کیا؟»

نگاهِ بے محابا چاهتا هوں
تغافلهای تمکیں آزما کیا؟

نفس، موجِ محیطِ بیخودی هے
تغافلهای ساقی کا گلا کیا؟

دلِ هر قطره، هے سازِ «آنا البَحر»
هم اُس کے هیں، همارا پوچھنا کیا؟

محابا کیا هے؟ میں ضامن، ادهر دیکھ
شهیدانِ نگہ کا خوں‌بہا کیا؟

سُن ، اے غارتگرِ جنسِ وفا ! سُن
شکستِ قیمتِ دل کی صدا کیا ؟

۱۷

درخورِ قہر و غضب ، جب کوئی ہم سا ، نہوا
پھر غلط کیا ھے کہ ہم سا کوئی پیدا نہوا ؟

بندگی میں بھی ، وہ آزادہ و خودبیں ھیں کہ ہم
اُلٹے پھر آئے ، درِ کعبہ اگر وا نہوا

سینہ کا داغ ھے ، وہ نالہ کہ لب تک نگیا
خاک کا رزق ھے ، وہ قطرہ کہ دریا نہوا

نام کا میرے ھے ، جو دکھ کہ کسی کو نملا
کام میں میرے ھے ، جو فتنہ کہ برپا نہوا

ھر بُنِ مو سے ، دمِ ذکر، نہ ٹپکے خوناب
حمزہ کا قصہ ھوا ، عشق کا چرچا نہوا !

قطرہ میں دجلہ دکھائی ندے ، اور جزو میں کل
کھیل لڑکوں کا ھوا ، دیدۂ بینا نہوا !

تھی خبر گرم کہ غالب کے اُڑیں گے پرزے
دیکھنے ہم بھی گئے تھے، پہ تماشا نہوا

۱۸

زکاتِ حسن دے، اے جلوۂ بینش! کہ مہر آسا
چراغِ خانۂ درویش ہو، کاسہ گدائی کا

وہی اك بات ہے، جو یاں نفس، واں نکہتِ گل ہے
چمن کا جلوہ، باعث ہے مری رنگیں نوائی کا

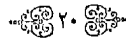
۱۹

زہرہ گر ایسا ہی، شامِ ہجر میں، ہوتا ہے آب
پرتوِ مہتاب، سیلِ خانماں ہوجائیگا

دل کو ہم صرفِ وفا سمجھے تھے، کیا معلوم تھا؟
یعنی، یہ پہلے ہی نذرِ امتحاں ہوجائیگا

سب کے دل میں ہے جگہ تیری؛ جو تو راضی ہوا
مجھ پہ، گویا، اك زمانہ مہرباں ہوجائیگا

وای ! گر میرا ترا انصاف محشر میں نہو
اب تلک تو یہ توقّع ھے کہ واں ھوجائیگا



درد ، منت کشِ دوا نہوا
میں نہ اچھا ھوا ، برا نہوا

ھے خبر گرم اُن کے آنے کی
آج ھی ، گھر میں بوریا نہوا !

کیا وہ نمرود کی خدائی تھی ؟
بندگی میں ، مرا بھلا نہوا

جان دی ، دی ھوئی اُسی کی تھی
حق تو یوں ھے کہ حق ادا نہوا

زخم گر دب گیا ، لہو نہ تھما
کام گر رك گیا ، روا نہوا

رھزنی ھے ، کہ دلستانی ھے !
لیکے دل ، دلستاں روانہ ھوا

۲۱

دل اُسکو، پہلے ھی ناز و ادا سے، دے بیٹھے
ھمیں دماغ کہاں، حسن کے تقاضا کا؟
فلک کو دیکھ کے، کرتا ھوں اُسکو یاد، اسد
جفا میں اُس کی، ھے انداز کارفرما کا

۲۲

اعتبارِ عشق کی خانہ خرابی دیکھنا!
غیر نے کی آہ، لیکن وہ خفا مجھ پر ھوا

۲۳

میں، اور بزمِ مے سے یوں تشنہ کام آؤں!
گر میں نے کی تھی توبہ، ساقی کو کیا ھوا تھا؟
ھے ایک تیر، جس میں دونوں چھدے پڑے ھیں
وہ دن گئے کہ اپنا دل سے جگر جدا تھا!
درماندگی میں، غالب، کچھ بن پڑے، تو جانوں
جب رشتہ بے گرہ تھا، ناخن گرہ کشا تھا

۲٤

گھر ھمارا، جو نہ روتے بھی، تو ویراں ھوتا
بحر، گر بحر نہوتا، تو بیاباں ھوتا
تنگیء دل کا گلا کیا؟ یہ وہ کافر دل ھے
کہ اگر تنگ نہوتا، تو پریشاں ھوتا

۲٥

نہ تھا کچھ، تو خدا تھا؛ کچھ نہوتا، تو خدا ھوتا
ڈبویا مجکو ھونے نے؛ نہوتا میں، تو کیا ھوتا!
ھوا جب غم سے یوں بیحس، تو غم کیا سر کے کٹنے کا؟
نہوتا گر جدا تن سے، تو زانو پر دھرا ھوتا
ھوئی مدت کہ غالب مر گیا؛ پر یاد آتا ھے
وہ ھر یک بات پر کہنا کہ «یوں ھوتا، تو کیا ھوتا؟»

۲٦

بلبل کے کاروبار پہ ھیں خندہ‌ھای گل
کہتے ھیں جسکو عشق، خلل ھے دماغ کا

۲۷

تھا گریزاں مژۂ یار سے دل ، تا دمِ مرگ
دفعِ پیکانِ قضا ، اسقدر آساں سمجھا !

۲۸

پھر مجھے دیدۂ تر یاد آیا
دل ، جگر تشنۂ فریاد آیا

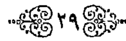
دم لیا تھا نہ قیامت نے ہنوز
پھر ترا وقتِ سفر یاد آیا !

زندگی یوں بھی گزر ہی جاتی !
کیوں ترا راہگزر یاد آیا ؟

کیا ہی رضواں سے لڑائی ہوگی ،
گھر ترا خلد میں گر یاد آیا !

پھر ترے کوچہ کو جاتا ہے خیال
دلِ گم گشتہ مگر یاد آیا !

کوئی ویرانی سی ویرانی ھے!
دشت کو دیکھ کے، گھر یاد آیا



ھوئی تاخیر، تو کچھ باعثِ تاخیر بھی تھا
آپ آتے تھے، مگر کوئی عناں گیر بھی تھا

تم سے بیجا ھے، مجھے اپنی تباھی کا گلا
اُس مین کچھ شایبۂ خوبیء تقدیر بھی تھا

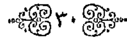
تو مجھے بھول گیا ھو، تو پتا بتلا دوں؟
کبھی فتراک میں تیرے، کوئی نخچیر بھی تھا؟

یوسف اُسکو کہوں اور کچھ نہ کہے؟ خیر ھوئی!
گر بگڑ بیٹھے، تو میں لایقِ تعزیر بھی تھا

پیشہ میں عیب نہیں؛ رکھیے نہ فرھاد کو نام
ھم ھی آشفتہ سروں میں، وہ جواں میر بھی، تھا

ھم تھے مرنے کو کھڑے، پاس نہ آیا، نہ سہی
آخر، اُس شوخ کے ترکش میں، کوئی تیر بھی تھا؟

پکڑے جاتے ھین ؛ فرشتوں کے لکھے پر ناحق
آدمی کوئی ھمارا دمِ تحریر بھی تھا ؟

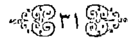


تو دوست کسی کا بھی ، ستمگر ، نہوا تھا
اوروں پہ ھے وہ ظلم کہ مجھ پر نہوا تھا

چھوڑا ، مہِ نخشب کی طرح ، دستِ قضا نے
خُرشید ، ھنوز ، اُس کے برابر نہوا تھا

توفیق باندازۂ ھمت ھے ، ازل سے
آنکھوں میں ھے ، وہ قطرہ کہ گوھر نہوا تھا

دریای معاصی ، تنک آبی سے ، ھوا خشک
میرا سرِ دامن بھی ، ابھی ، تر نہوا تھا



کیا کہوں بیماریء غم کی فراغت کا بیاں ؟
جو کہ کھایا خونِ دل ، بے منتِ کیموس تھا

۳۲

آئینہ دیکھ ، اپنا سا منہ لیکے ، رہ گئے
صاحب کو، دل ندینے پہ ، کتنا غرور تھا !

قاصد کو ، اپنے ھاتھ سے گردن نہ ماریے
اُسکی خطا نہیں ھے ؛ یہ میرا قصور تھا

۳۳

عرضِ نیازِ عشق کے قابل نہیں رہا
جس دل پہ ناز تھا مجھے ، وہ دل نہیں رہا

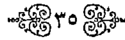
مرنے کی ، اے دل ! اور ھی تدبیر کر؛ کہ میں
شایانِ دست و بازوی قاتل نہیں رہا !

وا کردیے ھیں ، شوق نے ، بندِ نقابِ حسن
غیر از نگاہ ، اب کوئی حایل نہیں رہا

۳٤

رشك کہتا ھے کہ « اسکا غیر سے اخلاص ، حیف ! »
عقل کہتی ھے کہ « وہ بے مہر کس کا آشنا ؟ »

میں ، اور اک آفت کا ٹکڑا، وہ دلِ وحشی کہ ہے
عافیت کا دشمن اور آوارگی کا آشنا !



ذکر اُس پری‌وش کا ، اور پھر بیاں اپنا !
بن گیا رقیب ، آخر ، تھا جو رازداں اپنا

مے وہ کیوں بہت پیتے بزمِ غیر میں ؟ یا رب !
آج ھی ھوا منظور ، اُنکو امتحاں اپنا

منظر اک ، بلندی پر ، اور ھم بنا سکتے
عرش سے اِدھر ھوتا ، کاشکے ! مکاں اپنا

دردِ دل لکھوں کبتک ؟ جاؤں ، انکو دکھلادوں
انگلیاں فگار اپنی ، خامہ خونچکاں اپنا

گھستے گھستے مٹ جاتا ، آپ نے عبث بدلا
ننگِ سجدہ سے میرے ، سنگِ آستاں اپنا

ھم کہاں کے دانا تھے ؟ کس ھنر میں یکتا تھے ؟
بے سبب ھوا ، غالب ، دشمن آسماں اپنا !

۳٦

سرمۂ مفتِ نظر ہوں : مری قیمت یہ ہے
کہ رہے چشمِ خریدار پہ احساں میرا

۳۷

رحمت اگر قبول کرے ، کیا بعید ہے !
شرمندگی سے ، عذر نکرنا گناہ کا

مقتل کو کس نشاط سے جاتا ہوں میں : کہ ہے
پُرگل ، خیالِ زخم سے ، دامن نگاہ کا !

۳۸

جور سے باز آئے پر باز آئیں کیا ؟
کہتے ہیں : « ہم تجکو منہ دکھلائیں کیا ؟ »

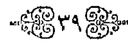
رات دن ، گردش میں ہیں سات آسماں
ہو رہیگا کچھ نہ کچھ ، گھبرائیں کیا ؟

ہو لیے کیوں نامہ بر کے ساتھ ساتھ ؟
یا رب ! اپنے خط کو ہم پہنچائیں کیا ؟

موجِ خوں سر سے گزر ھی کیوں نہ جائے
آستانِ یار سے اُٹھ جائیں کیا؟

عمر بھر، دیکھا کیا مرنے کی راہ
مر گئے پر، دیکھیے، دکھلائیں کیا؟

پوچھتے ھیں وہ کہ «غالب کون ھے؟»
کوئی بتلاؤ کہ ھم بتلائیں کیا؟



عشرتِ قطرہ ھے، دریا میں فنا ھو جانا
درد کا حد سے گزرنا، ھے دوا ھو جانا

تجھ سے، قسمت میں مری، صورتِ قفلِ اَبجَد
تھا لکھا، بات کے بنتے ھی، جدا ھو جانا!

اب جفا سے بھی ھیں محروم ھم، اللہ، اللہ!
اسقدر دشمنِ اربابِ وفا ھو جانا!!

دل سے مٹنا تری انگشتِ حنائی کا خیال
ھو گیا گوشت سے ناخن کا جدا ھو جانا

ب

جو ہوا غرقۂ مے، بختِ رسا رکھتا ہے
سر سے گزرے پہ بھی، ہے بالِ ہما، موجِ شراب

ت

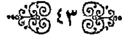
افسوس! کہ دنداں کا کیا رزق فلک نے
جن لوگوں کی، تھی درخورِ عقدِ گہر، انگشت

۴۲

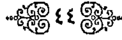
رہا گر کوئی تا قیامت سلامت
پھر اک روز مرنا ہے، حضرت سلامت!

جگر کو مرے، عشقِ خونابہ مشرب
لکھے ہے، «خداوندِ نعمت، سلامت!»

عَلی الرَّغمِ دشمن شہیدِ وفا ہوں
مبارک، مبارک! سلامت، سلامت!



مندگئیں ، کھولتے ہی کھولتے ، آنکھیں ، غالب
یار لائے مری بالیں پہ اُسے ، پر کسوقت !



عشق میں ، بیدادِ رشکِ غیر نے مارا مجھے
کشتۂ دشمن ہوں ، آخر؛ گرچہ تھا بیمارِ دوست

چشمِ ما روشن ! کہ اُس بیدرد کا دل شاد ہے
دیدۂ پرخوں ہمارا ، ساغرِ سرشارِ دوست

یہ غزل اپنی ، مجھے جی سے پسند آتی ہے آپ
ہے ردیفِ شعر میں ، غالب ، زبس تکرارِ دوست



اے عافیت ! کنارہ کر؛ اے انتظام ! چل
سیلابِ گریہ ، درپیء دیوار و در ہے ، آج

۴٦

لو، ہم مریضِ عشق کے بیماردار ہیں
اچھا اگر نہ ہو، تو مسیحا کا کیا علاج ؟

د

حسن، غمزے کی کشاکش سے چھٹا، میرے بعد
بارے، آرام سے ہیں اہلِ جفا، میرے بعد

شمع بجھتی ہے، تو اُس میں سے دھواں اُٹھتا ہے
شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا، میرے بعد

خوں ہے دل، خاک میں، احوالِ بتاں پر: یعنی
ان کے ناخن ہوے محتاجِ حنا، میرے بعد

«کون ہوتا ہے حریفِ مےء مردافگنِ عشق ؟»
ہے مکرر لبِ ساقی میں صَلا، میرے بعد

غم سے مرتا ہوں، کہ اتنا نہیں دنیا میں کوئی
کہ کرے تعزیتِ مہر و وفا، میرے بعد



ر

بلا سے ، ہیں جو بہ پیشِ نظر، در و دیوار !
نگاہِ شوق کو ہیں بال و پر ، در و دیوار

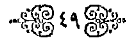
وفورِ اشک نے کاشانہ کا کیا یہ رنگ
کہ ہو گئے مرے دیوار و در ، در و دیوار

نہیں ہے سایہ ؛ کہ سنکر نویدِ مقدمِ یار
گئے ہیں چند قدم پیشتر ، در و دیوار

ہجومِ گریہ کا سامان کب کیا میں نے
کہ گر پڑے نہ مرے پانو پر در و دیوار ؟

وہ آ رہا مرے ہمسایہ میں ، تو سائے سے
ہوئے فدا در و دیوار پر ، در و دیوار

نظر میں کھٹکے ہے ، بن تیرے ، گھر کی آبادی
ہمیشہ روتے ہیں ہم ، دیکھکر در و دیوار



گھر جب بنا لیا ترے در پر ، کہے بغیر
جانےگا اب بھی تو نہ مرا گھر، کہے بغیر؟

کام اُس سے آپڑا ہے ، کہ جسکا جہان میں
لیوے نہ کوئی نام ، ستمگر کہے بغیر

چھوڑوں‌گا میں نہ اُس بتِ کافر کا پوجنا
چھوڑے نہ خلق، گو، مجھے کافر کہے بغیر!

مقصد ہے ناز و غمزہ ؛ ولے گفتگو میں کام
چلتا نہیں ہے ، دشنہ و خنجر کہے بغیر

ہر چند ، ہو مشاهدۂ حق کی گفتگو
بنتی نہیں ہے ، بادہ و ساغر کہے بغیر

بہرا ہوں میں ، تو چاہئیے دونا ہو التفات
سنتا نہیں ہوں بات ، مکرر کہے بغیر



کیوں جل گیا نہ تابِ رخِ یار دیکھکر؟
جلتا ہوں، اپنی طاقتِ دیدار دیکھکر

کیا آبروی عشق؟ جہاں عام ہو جفا
رُکتا ہوں، تمکو «بے سبب آزار» دیکھکر

ثابت ہوا ہے، گردنِ مینا پہ، خونِ خلق
لرزے ہے موجِ مَی، تری رفتار دیکھکر

بکجاتے ہیں ہم آپ، متاعِ سخن کیساتھ
لیکن عِیارِ طبعِ خریدار دیکھکر

زنار باندھ، سُبحۂ صد دانہ توڑ ڈال
رہرو، چلے ہے راہ کو ہموار دیکھکر

گرنی تھی ہم پہ برقِ تجلی، نہ طور پر
دیتے ہیں بادہ، ظرفِ قدح خوار دیکھکر

سر پھوڑنا وہ، غالبِ شوریدہ حال کا
یاد آ گیا مجھے، تری دیوار دیکھکر!



نہ چھوڑی حضرتِ یوسف نے یاں بھی خانہ آرائی
سفیدی دیدۂ یعقوب کی پھرتی ہے زنداں پر

فراغت کسقدر رہتی مجھے، تشویشِ مرہم سے!
بہم گر صلح کرتے پارہای دل، نمکداں پر

مجھے، اب دیکھکر ابرِ شفق آلودہ، یاد آیا
کہ فرقت میں تری، آتش برستی تھی گلستاں پر

نہ لڑ ناصح سے، غالب؛ کیا ہوا گر اُس نے شدت کی؟
ہمارا بھی تو، آخر، زور چلتا ہے گریباں پر!



ہے بسکہ، ہر اك اُن کے اشارے میں، نشاں اور
کرتے ہیں محبت، تو گزرتا ہے گماں اور

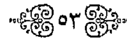
یا رب! وہ نہ سمجھے ہیں، نہ سمجھیں گے مری بات
دے اور دل اُنکو، جو نہ دے مجکو زباں اور!

تم شہر میں ہو، تو ہمیں کیا غم؟ جب اُٹھینگے
لے آئیں گے، بازار سے جا کر، دل و جاں اور

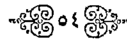
ہے خونِ جگر جوش میں؛ دل کھولکے روتا،
ہوتے جو کئی دیدۂ خونابہ فشاں اور!

مرتا ہوں اس آواز پہ! ہرچند سر اُڑ جائے
جلاد کو، لیکن، وہ کہے جائیں کہ «ہاں اور!»

پاتے نہیں جب راہ، تو چڑھ جاتے ہیں نالے
رکتی ہے مری طبع، تو ہوتی ہے رواں اور



نہ کی، سامانِ عیش و جاہ نے، تدبیر وحشت کی
ہوا، جامِ زمرد بھی مجھے داغِ پلنگ، آخر



جنوں کی دستگیری کس سے ہو، گر ہو نہ عریانی؟
گریباں چاك کا حق ہو گیا ہے، میری گردن پر

هم اور وہ بے سبب رنج، آشنا دشمن، کہ رکھتا ھے
شعاعِ مہر سے، تہمت نگہ کی، چشمِ روزن پر!



مٹ جائیگا سر، گر ترا پتھر نہ گھسیگا
ہوں، در پہ ترے ناصیہ فرسا، کوئی دن اور

جاتے ہوئے کہتے ہو: «قیامت کو ملینگے»
کیا خوب! قیامت کا ھے، گویا، کوئی دن اور

ناداں ہو، جو کہتے ہو کہ، کیوں جیتے ہیں غالب
قسمت میں ھے، مرنے کی تمنا، کوئی دن اور



کیونکر اُس بت سے رکھوں جان عزیز؟
کیا نہیں ھے مجھے ایمان عزیز؟

دل سے نکلا؛ پہ نہ نکلا دل سے
ھے، ترے تیر کا پیکان، عزیز

تاب لائے ہی بنے گی، غالب
واقعہ سخت ہے، اور جان عزیز



نہ گلِ نغمہ ہوں، نہ پردۂ ساز
میں ہوں اپنی شکست کی آواز

تو اور آرایشِ خمِ کاکل
میں اور اندیشہ‌ہای دور دراز!

س

مُند گئیں، کھولتے ہی کھولتے، آنکھیں، ہے، ہے!!
خوب وقت آئے تم، اس عاشقِ بیمار کے پاس!

دیکھکر تجکو، چمن بس کہ نمو کرتا ہے
خود بخود پہنچے ہے گل، گوشۂ دستار کے پاس

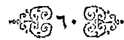
مر گیا، پھوڑ کے سر، غالبِ وحشی، ہے، ہے!!
بیٹھنا اُس کا وہ، آ کر تری دیوار کے پاس!

ک

زخم پر چھڑکیں کہاں، طفلانِ بے پروا، نمک؟
کیا مزا ہوتا، اگر پتھر میں بھی ہوتا نمک!

داد دیتا ہے مرے زخمِ جگر کی، واہ، واہ!
یاد کرتا ہے مجھے، دیکھے ہے وہ جس جا نمک

یاد ہیں، غالب، تجھے وہ دن، کہ وجدِ ذوق میں
زخم سے گرتا، تو میں پلکوں سے چنتا تھا نمک؟



ہم نے مانا کہ تغافل نہ کروگے؛ لیکن
خاک ہو جائینگے ہم، تم کو خبر ہوتے تک

ل

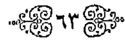
ایجاد کرتی ہے اسے تیرے لئے، بہار
میرا رقیب ہے، نفسِ عطر سای گل

تیرے ہی جلوہ کا ہے یہ دھوکا کہ آج تک
بے اختیار، دوڑے ہے گل در قفای گل

م

غم نہیں ہوتا ہے آزادوں کو، بیش از یک نفس
برق سے، کرتے ہیں روشن شمعِ ماتم‌خانہ، ہم

دایم الحبس اس میں ہیں لاکھوں تمنائیں، اسد!
جانتے ہیں، سینۂ پر خوں کو زنداں خانہ، ہم



مجکو دیارِ غیر میں مارا، وطن سے دور
رکھ لی مرے خدا نے، مری بیکسی کی شرم

وہ حلقہای زلف کمیں میں ہیں؛ اے خدا
رکھ لیجو، میرے دعوی وارستگی کی شرم!

ن

لوں وام بختِ خفتہ سے یک خوابِ خوش؛ ولے
غالب، یہ خوف ہے کہ کہاں سے ادا کروں؟

۶۵

کی وفا ہم سے، تو غیر اس کو جفا کہتے ہیں
ہوتی آئی ہے کہ اچھوں کو برا کہتے ہیں

آج، ہم اپنی پریشانیٔ خاطر اُن سے
کہنے جاتے تو ہیں، پر دیکھیے، کیا کہتے ہیں؟

اگلے وقتوں کے ہیں یہ لوگ، انھیں کچھ نہ کہو
جو مے و نغمہ کو اندوہ ربا کہتے ہیں

ہے پرے سرحدِ ادراک سے، اپنا مسجود
قبلہ کو، اہلِ نظر «قبلہ نما» کہتے ہیں

دیکھیے، لاتی ہے اُس شوخ کی نخوت کیا رنگ؟
اُس کی ہر بات پہ ہم «نامِ خدا!» کہتے ہیں

۶۶

آبرو کیا خاک اُس گل کی، کہ گلشن میں نہیں؟
ہے گریباں ننگِ پیراہن، جو دامن میں نہیں

ضعف سے، اے گریہ! کچھ باقی مرے تن میں نہیں
رنگ ہو کر اُڑ گیا، جو خوں کہ دامن میں نہیں

ہو گئے ہیں جمع، اجزای نگاہِ آفتاب؛
ذرے، اُسکے گھر کی دیواروں کے روزن میں، نہیں

ہو فشارِ ضعف میں کیا، ناتوانی کی نمود؟
قد کے جھکنے کی بھی گنجایش مرے تن میں نہیں



عہدے سے، مدحِ ناز کے، باہر نہ آسکا!
گر ایک ادا ہو، تو اُسے اپنی قضا کہوں

میں اور صد ہزار نوای جگر خراش!
تو اور ایک وہ نہ شنیدن، کہ کیا کہوں!

ظالم، مرے گماں سے مجھے منفعل نہ چاہ!
ہے، ہے! خدا نکردہ! تجھے بیوفا کہوں!

۶۸

مہرباں ہو کے بلا لو مجھے، چاہو جسوقت
میں، گیا وقت نہیں ہوں، کہ پھر آ بھی نہ سکوں

ضعف میں، طعنۂ اغیار کا شکوہ کیا ہے ؟
بات، کچھ سر تو نہیں ہے، کہ اُٹھا بھی نہ سکوں

زہر ملتا ہی نہیں مجکو، ستمگر ؛ ورنہ
کیا قسم ہے ترے ملنے کی، کہ کھا بھی نہ سکوں؟

۶۹

ہم سے کھل جاؤ، بوقتِ مَی پرستی، ایک دن
ورنہ ہم چھیڑیں گے، رکھکر عذرِ مستی، ایک دن

۷۰

ہم پر، جفا سے، ترکِ وفا کا گماں نہیں
اِک چھیڑ ہے ؛ وگرنہ مراد امتحاں نہیں

کس منہ سے شکر کیجیے اس لطفِ خاص کا ؟
پرسش ہے، اور پای سخن درمیاں نہیں

ہم کو ستم عزیز، ستمگر کو ہم عزیز
نا مہرباں نہیں ھے ، اگر مہرباں نہیں

بوسہ نہیں ، نہ دیجیے ، دشنام ھی سہی
آخر زباں تو رکھتے ھو تم ، گر دہاں نہیں

ہر چند جانگدازیء قہر و عتاب ھے ؛
ہر چند پشت گرمیء تاب و تواں نہیں

جاں ، مطربِ ترانۂ «ہَل مِن مَزِید» ھے
لب ، پردہ سنجِ زمزمۂ «اَلاَماں» نہیں

خنجر سے چیر سینہ ، اگر دل نہ ہو دو نیم
دل میں چھری چبھو ، مژہ گر خونچکاں نہیں

ھے ننگِ سینہ ، دل اگر آتشکدہ نہ ہو
ھے عارِ دل ، نفس اگر آذر فشاں نہیں

نقصاں نہیں جنوں میں ؛ بلا سے ہو گھر خراب
سو گز زمیں کے بدلے ، بیاباں گراں نہیں

جاں ہے بہای بوسہ ؛ ولے کیوں کہیے ، ابھی
غالب کو جانتا ہے کہ وہ نیمجاں نہیں

۷۱

مانعِ دشت نوردی ، کوئی تدبیر نہیں
ایک چکر ہے مرے پانوں میں ، زنجیر نہیں

سر کھجاتا ہے ، جہاں زخمِ سر اچھا ہو جائے
لذتِ سنگ باندازۂ تقریر نہیں

۷۲

مت ، مردمکِ دیدہ میں ، سمجھو یہ نگاہیں
ہیں جمع ، سویدای دلِ چشم میں ، آہیں

۷۳

برشکالِ گریۂ عاشق ہے ؛ دیکھا چاہیے
کھِل گئی ، مانندِ گل سو جا سے ، دیوارِ چمن

۷٤

ہے تجلی تری سامانِ وجود
ذرہ بے پرتوِ خُرشید نہیں

کہتے ہیں «جیتے ہیں امید پہ لوگ»
ہم کو جینے کی بھی امید نہیں

۷۵

ترے سروِ قامت سے ، اك قدِ آدم
قیامت کے فتنے کو کم دیکھتے ہیں

۷٦

ملتی ہے خوی یار سے ، نار ، التہاب میں
کافر ہوں ، گر نہ ملتی ہو راحت عذاب میں

تا پھر نہ انتظار میں نیند آئے عمر بھر
آنے کا وعدہ کر گئے ، آئے جو خواب میں

قاصد کے آتے آتے ، خط اك اور لکھ رکھوں
میں جانتا ہوں ، جو وہ لکھیں گے جواب میں

مجھ تک کب اُنکی بزم میں آتا تھا دورِ جام ؟
ساقی نے کچھ ملا نہ دیا ہو شراب میں ؟

میں اور حظِ وصل، خداساز بات ہے!
جاں نذر دینی بھول گیا اضطراب میں

ھے تیوری چڑھی ہوئی، اندر نقاب کے
ھے اك شکن پڑی ہوئی، طرفِ نقاب میں

لاکھوں لگاؤ، ایك چرانا نگاہ کا!
لاکھوں بناؤ ایك بگڑنا عتاب میں!

وہ نالہ، دل میں خس کے برابر جگہ نہ پائے
جس نالہ سے، شگاف پڑے آفتاب میں!

وہ سحر، مدعا طلبی میں نہ کام آئے
جس سحر سے، سفینہ رواں ہو سراب میں!



اُتنا ھی مجکو اپنی حقیقت سے بعد ھے
جتنا کہ وھمِ غیر سے ہوں پیچ و تاب میں

اصلِ شہود و شاہد و مشہود ایک ہے
حیراں ہوں، پھر مشاہدہ ہے کس حساب میں!

ہے مشتمل نمودِ صُوَر پر وجودِ بحر
یاں کیا دھرا ہے قطرہ و موج و حباب میں؟

ہے غیبِ غیب، جس کو سمجھتے ہیں ہم شہود
ہیں خواب میں ہنوز، جو جاگے ہیں خواب میں



چھوڑا نہ رشک نے کہ ترے گھر کا نام لوں
ہر اک سے پوچھتا ہوں کہ جاؤں کدھر کو میں؟

جانا پڑا رقیب کے در پر ہزار بار
اے کاش! جانتا نہ ترے رہگزر کو میں

ہے کیا، جو کس کے باندھیے؟ میری بلا ڈرے!
کیا جانتا نہیں ہوں تمھاری کمر کو میں؟

لو وہ بھی کہتے ہیں کہ: «یہ بے ننگ و نام ہے»
یہ جانتا اگر، تو لٹاتا نہ گھر کو میں

چلتا ہوں تھوڑی دور ہر اك تیز رو کے ساتھ؛
پہچانتا نہیں ہوں، ابھی، راہبر کو میں

خواہش کو احمقوں نے پرستش دیا قرار
کیا پوجتا ہوں اُس بتِ بیدادگر کو میں؟



ذکر میرا بہ بدی بھی اُسے منظور نہیں
غیر کی بات بگڑ جائے، تو کچھ دور نہیں

وعدۂ سیرِ گلستاں ہے، خوشا طالعِ شوق!
مژدۂ قتل مقدر ہے، جو مذکور نہیں

شاہدِ ہستیء مطلق کی کمر ہے عالم
لوگ کہتے ہیں کہ «ہے»، پر ہمیں منظور نہیں

قطرہ اپنا بھی حقیقت میں ہے دریا؛ لیکن
ہم کو تقلیدِ تنك ظرفیء منصور نہیں

میں جو کہتا ہوں کہ «ہم لینگے قیامت میں تمھیں»
کس رُعونت سے وہ کہتے ہیں کہ «ہم حور نہیں»!



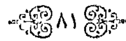
ناله جز حسنِ طلب ، اے ستم ایجاد ! نہیں
ہے تقاضای جفا ، شکوۂ بیداد نہیں

عشق و مزدوریِ عشرتگہِ خسرو، کیا خوب !
ہم کو تسلیم ، نکونامیِ فرہاد ، نہیں

کم نہیں وہ بھی خرابی میں ، پہ وسعت معلوم !
دشت میں ہے مجھے وہ عیش کہ گھر یاد نہیں

نفی سے کرتی ہے اثبات تراوش ، گویا
دی ہے ، جای دہن اُسکو دمِ ایجاد ، نہیں

کم نہیں جلوہ‌گری میں ترے کوچہ سے ، بہشت
یہی نقشہ ہے ، ولے اسقدر آباد نہیں



دونوں جہان دیکے ، وہ سمجھے ، یہ خوش رہا
یاں آ پڑی یہ شرم کہ تکرار کیا کریں !

تھک تھک کے ، ہر مقام پہ دو چار رہ گئے
تیرا پتہ نہ پائیں ، تو ناچار کیا کریں ؟

۸۲

وہ آئے گھر مین ہمارے ؛ خدا کی قدرت ہے !
کبھی ہم اُنکو ، کبھی اپنے گھر کو دیکھتے ہیں

نظر لگے نہ کہیں اُس کے دست و بازو کو !
یہ لوگ کیوں مرے زخمِ جگر کو دیکھتے ہیں ؟

۸۳

علاوہ عید کے ، ملتی ہے اور دن بھی شراب
گدای کوچۂ میخانہ نامراد نہیں

جہاں میں ہو غم و شادی بہم ؛ ہمیں کیا کام ؟
دیا ہے ہم کو خدا نے وہ دل کہ شاد نہیں

تم اُنکے وعدہ کا ذکر اُن سے کیوں کرو ، غالب ؟
یہ کیا کہ تم کہو ، اور وہ کہیں کہ « یاد نہیں » ؟

۸٤

تیرے توسن کو صبا باندھتے ہیں
ہم بھی مضمون کی ہوا باندھتے ہیں

قیدِ ہستی سے رہائی معلوم!
اشک کو بے سر و پا باندھتے ہیں

اہلِ تدبیر کی واماندگیاں!
آبلوں پر بھی حنا باندھتے ہیں

۸۵

دایم پڑا ہوا ترے در پر نہیں ہوں میں
خاک ایسی زندگی پہ کہ پتھر نہیں ہوں میں!

یا رب! زمانہ مجکو مٹاتا ہے کس لئے؟
لوحِ جہاں پہ حرفِ مکرر نہیں ہوں میں

حد چاہیے سزا میں، عقوبت کے واسطے
آخر، گناہگار ہوں، کافر نہیں ہوں میں!

۸٦

سب کہاں ، کچھ لاله و گل میں نمایاں هو گئیں
خاك میں ، کیا صورتیں هونگی که پنہاں هو گئیں!

یاد تھیں هم کو بھی رنگا رنگ بزم آرائیاں ؛
لیکن اب نقش و نگارِ طاقِ نسیاں هو گئیں

قید میں یعقوب نے لی ، گو ، نه یوسف کی خبر؛
لیکن آنکھیں روزنِ دیوارِ زنداں هو گئیں

جوی خوں آنکھوں سے بہنے دو؛ که هے شامِ فراق
میں یه سمجھونگا که شمعیں دو فروزاں هو گئیں

ان پریزادوں سے ، لینگے خلد میں هم انتقام
قدرتِ حق سے ، یہی حوریں اگر واں هو گئیں

نیند اُسکی هے ، دماغ اُسکا هے ، راتیں اُسکی هیں
تیری زلفیں ، جس کے بازو پر ، پریشاں هو گئیں

بسکه روکا میں نے ، اور سینه میں اُبھریں پے به پے
میری آهیں ، بخیۂ چاكِ گریباں هو گئیں

ہم موحِّد ہین؛ ہمارا کیش ہے ترکِ رسوم
ملتیں جب مٹ گئیں، اجزای ایماں ہو گئیں

رنج سے خوگر ہوا انساں، تو مٹ جاتا ہے رنج
مشکلیں مجھپر پڑیں اتنی کہ آساں ہو گئیں

۸۷

دیوانگی سے، دوش پہ زنار بھی نہیں:
یعنی ہمارے جیب میں اک تار بھی نہیں

ملنا ترا اگر نہیں آساں، تو سہل ہے
دشوار تو یہی ہے کہ دشوار بھی نہیں

شوریدگی کے ہاتھ سے، ہے سر وبالِ دوش
صحرا میں، اے خدا! کوئی دیوار بھی نہیں؟

اس سادگی پہ کون نہ مرجائے؟ اے خدا!
لڑتے ہیں، اور ہاتھ میں تلوار بھی نہیں

۸۸

نہیں ہے زخم کوئی، بخیہ کے درخور، مرے تن میں
ہوا ہے تارِ اشکِ یاس، رشتہ چشمِ سوزن میں

ودیعت خانۂ بیدادِ کاوشہای مژگاں ہوں
نگینِ نامِ شاہد ہے مرے، ہر قطرہ خوں، تن میں

بیاں کس سے ہو ظلمت گستری میرے شبستاں کی ؟
شبِ مہ ہو، جو رکھدوں پنبہ دیواروں کے روزن میں

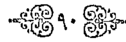
ہزاروں دل دیے، جوشِ جنونِ عشق نے مجکو
سیہ ہو کر، سویدا ہو گیا ہر قطرہ خوں تن میں

۸۹

مزے جہان کے اپنی نظر میں خاک نہیں!
سوای خونِ جگر، سو جگر میں خاک نہیں!

مگر غبار ہوے پر، ہوا اُڑا لیجائے؛
وگرنہ تاب و تواں بال و پر میں خاک نہیں!

ھوا ھوں عشق کی غارتگری سے شرمندہ
سوای حسرتِ تعمیر، گھر میں خاك نہیں



دل ھی تو ھے، نہ سنگ وخشت، درد سے بھر نہ آئے کیوں؟
روئیں گے ھم ھزار بار؛ کوئی ھمیں ستائے کیوں ؟

دیر نہیں ، حرم نہیں ، در نہیں ، آستاں نہیں
بیٹھے ھیں رھگزر پہ ھم ، غیر ھمیں اُٹھائے کیوں ؟

دشنۂ غمزہ جانستاں ، ناوكِ ناز بےپناہ
تیرا ھی عکسِ رخ سہی ، سامنے تیرے آئے کیوں ؟

قیدِ حیات و بندِ غم ، اصل میں دونوں ایك ھیں
موت سے پہلے ، آدمی غم سے نجات پائے کیوں ؟

حسن اور اُس پہ حسنِ ظن! رہ گئی بوالھوس کی شرم
اپنے پہ اعتماد ھے ، غیر کو آزمائے کیوں ؟

واں وہ غرورِ عز و ناز ، یاں یہ حجابِ پاسِ وضع!
راہ میں ھم ملیں کہاں ؟ بزم میں وہ بلائے کیوں ؟

غالبِ خسته کے بغیر، کون سے کام بند ہیں؟
روئیے زار زار کیا؟ کیجیے ہائے، ہائے کیوں؟

۹۱

غنچۂ ناشگفتہ کو دور سے مت دکھا کہ «یوں؟»
بوسہ کو پوچھتا ہوں میں، منہ سے مجھے بتا کہ «یوں»

رات کے وقت مَی پیے، ساتھ رقیب کو لیے
آئے وہ یاں، خدا کرے! پر نہ کرے خدا کہ یوں!

میں نے کہا کہ «بزمِ ناز چاہیے غیر سے تہی»
سنکے، ستم ظریف نے مجکو اُٹھا دیا کہ «یوں؟»

و

بقدرِ حسرتِ دل چاہیے، ذوقِ معاصی بھی
بھروں یک گوشۂ دامن، گر آبِ ہفت دریا ہو

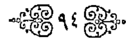
۹۳

کعبہ میں جا رہا، تو نہ دو طعنہ؛ کیا کہیں
بھولا ہوں حقِّ صحبتِ اہلِ کُنِشت کو؟

طاعت میں تا رہے نہ مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈالدو، کوئی لیکر بہشت کو

ہوں منحرف نہ کیوں، رہ و رسمِ ثواب سے؟
ٹیڑھا لگا ہے قط قلمِ سرنوشت کو

غالب، کچھ اپنی سعی سے لہنا نہیں مجھے
خرمن جلے، اگر نہ ملخ کھائے کشت کو



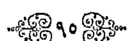
وارستہ اس سے ہیں کہ محبت ہی کیوں نہو؟
کیجے ہمارے ساتھ، عداوت ہی کیوں نہو؟

چھوڑا نہ مجھ میں ضعف نے رنگ اختلاط کا
ہے دل پہ بار، نقشِ محبت ہی کیوں نہو؟

«پیدا ہوئی ہے»، کہتے ہیں، «ہر درد کی دوا»
یوں ہو، تو چارۂ غمِ الفت ہی کیوں نہو؟

ہنگامۂ زبونیء ہمت ہے، انفعال
حاصل نہ کیجے دہر سے، عبرت ہی کیوں نہو؟

مٹتا ہے فوتِ فرصتِ ہستی کا غم کوئی!
عمرِ عزیز صرفِ عبادت ہی کیوں نہو؟



قفس میں ہوں؛ گر اچھا بھی نہ جانیں میرے شیون کو
مرا ہونا برا کیا ہے، نواسنجانِ گلشن کو
نہیں گر ہمدمی آساں، نہو، یہ رشک کیا کم ہے؟
نہ دی ہوتی، خدایا! آرزوی دوست دشمن کو!
خدا شرمائے ہاتھوں کو؛ کہ رکھتے ہیں کشاکش میں
کبھی میرے گریباں کو، کبھی جاناں کے دامن کو!
ابھی ہم قتلگہ کا دیکھنا آساں سمجھتے ہیں!
نہیں دیکھا، شناور جوی خوں میں، تیرے توسن کو
ہوا چرچا جو میرے پانو کی زنجیر بننے کا
کیا بیتاب، کاں میں، جنبشِ جوہر نے آہن کو
خوشی کیا، کھیت پر میرے اگر سو بار ابر آوے!
سمجھتا ہوں کہ ڈھونڈھے ہے، ابھی سے، برق خرمن کو

نہ لٹتا دن کو، تو کب رات کو یوں بیخبر سوتا؟
رہا کھٹکا نہ چوری کا؛ دعا دیتا ہوں رہزن کو

۹۶

دی سادگی سے جان، پڑوں کوہکن کے پانو!
ہیہات! کیوں نہ ٹوٹ گئے پیرزن کے پانو!

مرہم کی جستجو میں، پھرا ہوں جو دور دور
تن سے سوا فگار ہیں اس خستہ تن کے پانو

ہے جوشِ گل بہار میں یاں تک کہ ہر طرف
اُڑتے ہوے، اُلجھتے ہیں مرغِ چمن کے پانو

شب کو کسی کے خواب میں آیا نہو کہیں؟
دکھتے ہیں، آج، اُس بتِ نازک بدن کے پانو

۹۷

واں اُسکو ہولِ دل ہے تو یاں میں ہوں شرمسار:
یعنی یہ میری آہ کی تاثیر سے نہو؟

۹۸

واں پہنچکر، جو غش آتا پیء ہم ہے، ہم کو
صد رہ، آہنگِ زمیں بوسِ قدم ہے، ہم کو

جان کر کیجے تغافل، کہ کچھ امید بھی ہو
یہ نگاہِ غلط انداز تو سم ہے، ہم کو

تم وہ نازک کہ خموشی کو فغاں کہتے ہو!
ہم وہ عاجز کہ تغافل بھی ستم ہے، ہم کو!

۹۹

تم جانو، تم کو غیر سے جو رسم و راہ ہو
مجکو بھی پوچھتے رہو، تو کیا گناہ ہو؟

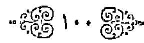
بچتے نہیں مواخذۂ روزِ حشر سے
قاتل اگر رقیب ہے، تو تم گواہ ہو

کیا وہ بھی بیگنہ کُش و حق ناشناس ہیں؟
مانا کہ تم بشر نہیں، خُرشید و ماہ ہو

اُبھرا ھوا نقاب میں ھے اُنکے، ایک تار
مرتا ھوں میں کہ یہ نہ کسی کی نگاہ ھو!

جب میکدہ چھٹا، تو پھر اب کیا جگہ کی قید؟
مسجد ھو، مدرسہ ھو، کوئی خانقاہ ھو!

سنتے ھیں جو بہشت کی تعریف، سب درست
لیکن، خدا کرے! وہ ترا جلوہ گاہ ھو



گئی وہ بات کہ ھو گفتگو، تو کیونکر ھو؟
کہے سے کچھ نہوا، پھر کہو تو، کیونکر ھو؟

تمھیں کہو کہ گزارا صنم پرستوں کا
بتوں کی ھو اگر ایسی ھی خو، تو کیونکر ھو؟

اُلجھتے ھو تم، اگر دیکھتے ھو آئینہ
جو تم سے، شہر میں ھوں ایک دو، تو کیونکر ھو؟

جسے نصیب ھو روزِ سیاہ میرا سا
وہ شخص دن نہ کہے رات کو، تو کیونکر ھو؟

۱۰۱

کسی کو دیکے دل ، کوئی نوا سنجِ فغاں کیوں ہو؟
نہو جب دل ھی سینہ میں، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

وہ اپنی خو نہ چھوڑینگے، ھم اپنی وضع کیوں چھوڑیں؟
سبک سر بنکے کیا پوچھیں کہ ، ھم سے سرگراں کیوں ہو؟

کیا غمخوار نے رسوا ؛ لگے آگ اس محبت کو!
نہ لاوے تاب جو غم کی ، وہ میرا رازداں کیوں ہو ؟

وفا کیسی ؟ کہاں کا عشق ؟ جب سر پھوڑنا ٹھہرا
تو پھر ، اے سنگ دل ! تیرا ھی سنگِ آستاں کیوں ہو؟

غلط ھے جذبِ دل کا شکوہ؛ دیکھو، جرم کس کا ھے؟
نہ کھینچو گر تم اپنے کو، کشاکش درمیاں کیوں ہو؟

یہی ھے آزمانا ، تو ستانا کس کو کہتے ھیں ؟
عدو کے ھو لیے جب تم ، تو میرا امتحاں کیوں ہو؟

نکالا چاھتا ھے کام کیا طعنوں سے تو، غالب ؟
ترے بیمہر کہنے سے ، وہ تجھ پر مہرباں کیوں ہو!

ی

مسجد کے زیرِ سایہ خرابات چاھئے
بھوں پاس آنکھ، قبلۂ حاجات ! چاھئے

سیکھے ھیں، مہ رخوں کیلئے ھم مصوری
تقریب کچھ تو بہرِ ملاقات چاھئے

مے سے غرض نشاط ھے کس روسیاہ کو؟
اک گونہ بیخودی، مجھے دن رات چاھئے

۱۰۳

بساطِ عجز میں تھا ایک دل، یک قطرہ خوں وہ بھی
سو رھتا ھے، باندازِ چکیدن سرنگوں، وہ بھی

نہ اتنا بُرّشِ تیغِ جفا پر ناز فرماؤ !
مرے دریای بیتابی میں ھے اک موجِ خوں، وہ بھی

مےء عشرت کی خواھش، ساقیء گردوں سے کیا کیجے؟
لئے بیٹھا ھے اک دو چار جامِ واژگوں، وہ بھی

۱۰٤

بیدادِ وفا دیکھہ کہ جاتی رہی، آخر
ہرچند مری جان کو تھا ربط لبوں سے

۱۰۵

تا، ہم کو شکایت کی بھی، باقی نہ رہے جا
سن لیتے ہیں، گو ذکر ہمارا نہیں کرتے
غالب، ترا احوال سنادیں گے ہم اُنکو
وہ سنکے بلا لیں، یہ اجارا نہیں کرتے

۱۰٦

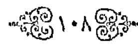
گھر میں تھا کیا کہ ترا غم اُسے غارت کرتا؟
وہ جو رکھتے تھے ہم، اک حسرتِ تعمیر، سو ہے

۱۰۷

کُھلے گا کسطرح مضموں مرے مکتوب کا، یارب؟
قسم کھائی ہے، اُس کافر نے کاغذ کے جلانے کی

ہماری سادگی تھی، التفاتِ ناز پر مرنا
ترا آنا نہ تھا، ظالم! مگر تمہید جانے کی

کہوں کیا خوبیء اوضاعِ ابنای زماں، غالب؟
بدی کی اُس نے، جس سے ہم نے کی تھی بارہا نیکی



کیا تنگ ہم ستم زدگاں کا جہان ہے
جس میں کہ ایک بیضۂ مور آسمان ہے!

ہے کائنات کو حرکت تیرے ذوق سے
پرتو سے آفتاب کے، ذرے میں جان ہے

کیا خوب! تم نے غیر کو بوسہ نہیں دیا؟
بس چپ رہو؛ ہمارے بھی منہ میں زبان ہے

ہے، بارے، اعتمادِ وفاداری اسقدر!
غالب، ہم اس میں خوش ہیں کہ نامہربان ہے

۱۰۹

کس طرح کاٹے کوئی ، شبہای تارِ برشکال؟
ہے نظر خوکردۂ اخترشماری ، ہائے ، ہائے!!
گوش مہجورِ پیام و چشم محرومِ جمال!
ایک دل ، تسپر یہ ناامیدواری ، ہائے ، ہائے!!

۱۱۰

سرگشتگی میں ، عالمِ ہستی سے یاس ہے
تسکیں کو دے نوید کہ «مرنے کی آس ہے»
لیتا نہیں مرے دلِ آوارہ کی خبر
ابتک وہ جانتا ہے کہ میرے ہی پاس ہے!
پی ، جسقدر ملے ، شبِ مہتاب میں شراب
اس بلغمی مزاج کو گرمی ہی راس ہے

۱۱۱

گر خامشی سے فائدہ اخفای حال ہے
خوش ہوں ؛ کہ میری بات سمجھنی محال ہے

ھے ، ھے ! خدا نخواستہ ، وہ اور دشمنی !
اے شوقِ منفعل ! یہ تجھے کیا خیال ھے ؟
ھستی کے مت فریب میں آجائیو ، اسد !
عالم تمام حلقۂ دامِ خیال ھے

۱۱۲

تم اپنے شکوہ کی باتیں نہ ، کھود کھود کے ، پوچھو
حذر کرو مرے دل سے ؛ کہ اس میں آگ دبی ھے

۱۱۳

ایك جا حرفِ وفا لکھا تھا ، سو بھی مٹ گیا
ظاھرا ، کاغذ ترے خط کا غلط بردار ھے
مجھ سے مت کہٗ : « تو ھمیں کہتا تھا اپنی زندگی » ؛
زندگی سے بھی مرا جی اندنوں بیزار ھے

۱۱٤

خزاں کیا ؟ فصلِ گل کہتے ھیں کس کو ؟ کوئی موسم ھو :
وھی ھم ھیں ، قفس ھے اور ماتم بال و پر کا ھے

وفای دلبراں ہے اتفاقی ؛ ورنہ ، اے ہمدم !
اثر فریادِ دلہای حزیں کا ، کس نے دیکھا ہے ؟

۱۱۵

پیکرِ عشاق ، سازِ طالعِ ناساز ہے
نالہ ، گویا ، گردشِ سیارہ کی آواز ہے

۱۱۶

عشق مجکو نہیں ، وحشت ھی سہی
میری وحشت ، تری شہرت ھی سہی

قطع کیجے نہ تعلق ہم سے
کچھ نہیں ہے ، تو عداوت ھی سہی

ہم کوئی ترکِ وفا کرتے ھیں ؟
نہ سہی عشق ، مصیبت ھی سہی

کچھ تو دے ، اے فلکِ نا انصاف !
آہ و فریاد کی رخصت ھی سہی

ہم بھی تسلیم کی خو ڈالیں گے
بے نیازی ، تری عادت ہی سہی

۱۱۷

ہے آرمیدگی میں نکوہش بجا مجھے
صبحِ وطن ، ہے خندۂ دنداں‌نما مجھے

مستانہ ، طے کروں ہوں رہِ وادیٔ خیال
تا بازگشت سے نہ رہے مدعا مجھے

کرتا ہے ، بسکہ ، باغ میں تو بےحجابیاں
آنے لگی ہے نکہتِ گل سے حیا مجھے

کھلتا کسی پہ کیوں ، مرے دل کا معاملہ ؟
شعروں کے انتخاب نے رسوا کیا مجھے!!

۱۱۸

اُس بزم میں ، مجھے نہیں بنتی حیا کئے
بیٹھا رہا ، اگرچہ اشارے ہوا کئے

دل ھی تو ھے؛ سیاستِ درباں سے ڈر گیا
میں اور جاؤں در سے ترے بن صدا کئے!

بے صرفہ ھی گزرتی ھے، ھو گرچہ عمرِ خضر
حضرت بھی کل کہیں گے کہ «ھم کیا کیا کئے؟»

ضد کی ھے اور بات؛ مگر خو بری نہیں
بھولے سے، اُس نے سیکڑوں وعدے وفا کئے

غالب، تمھیں کہو کہ «ملے گا جواب کیا؟»
مانا کہ تم کہا کئے اور وہ سنا کئے

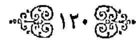
۱۱۹

رفتارِ عمر، قطعِ رہِ اضطراب ھے
اس سال کے حساب کو، برق آفتاب ھے

زخمی ھوا ھے پاشنہ پای ثبات کا
نے بھاگنے کی گوں، نہ اقامت کی تاب ھے

میں، نامراد دل کی تسلی کو کیا کروں؟
مانا کہ تیرے رخ سے نگہ کامیاب ھے

گزرا ، اسد ، مسرتِ پیغامِ یار سے ؛
قاصد پہ مجکو رشکِ سوال و جواب ہے!



دلِ ناداں ! تجھے ہوا کیا ہے ؟
آخر، اس درد کی دوا کیا ہے ؟

ہم ہیں مشتاق ، اور وہ بیزار
یا الٰہی ! یہ ماجرا کیا ہے ؟

میں بھی منہ میں زبان رکھتا ہوں :
کاش ! پوچھو کہ « مدعا کیا ہے؟ »

ق

جبکہ تجھ بن نہیں کوئی موجود
پھر یہ ہنگامہ ، ایخدا ! کیا ہے ؟

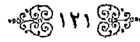
یہ پریچہرہ لوگ کیسے ہیں ؟
غمزہ و عشوہ و ادا کیا ہے ؟

شکنِ زلفِ عنبریں کیوں ہے ؟
نگہِ چشمِ سرمہ سا کیا ہے ؟

سبزہ و گل کہاں سے آئے ہیں ؟
ابر کیا چیز ہے ؟ ہوا کیا ہے ؟

ہم کو اُن سے وفا کی ہے امید ،
جو نہیں جانتے ، وفا کیا ہے ؟

میں نے مانا کہ کچھ نہیں **غالب**
مفت ہاتھ آئے ، تو برا کیا ہے ؟


۱۲۱

کہتے تو ہو تم سب کہ « بتِ غالیہ مو آئے ! »
یک مرتبہ گھبرا کے کہو کوئی کہ « وو آئے ! »

ہوں کشمکشِ نزع میں ، ہاں ! جذبِ محبت ،
کچھ کہہ نہ سکوں ، پر وہ مرے پوچھنے کو آئے !

ہے صاعقہ و شعلہ و سیماب کا عالم
آنا ہی سمجھ میں مرے آتا نہیں ، گو آئے

ظاہر ہے کہ گھبرا کے نہ بھاگیں گے نکیرین
ہاں ، منہ سے مگر بادۂ دوشینہ کی بو آئے

جلاد سے ڈرتے ہیں، نہ واعظ سے جھگڑتے
ہم سمجھے ہوئے ہیں اُسے، جس بھیس میں جو آئے

ہاں! اہلِ طلب، کون سنے طعنۂ نایافت؟
دیکھا کہ وہ ملتا نہیں، اپنے ہی کو کھو آئے

اپنا وہ نہیں شیوہ کہ آرام سے بیٹھیں
اُس در پہ نہیں بار، تو کعبہ ہی کو ہو آئے

کی ہمنفسوں نے اثرِ گریہ میں تقریر؛
اچھے رہے آپ اُس سے، مگر مجکو ڈبو آئے

اُس انجمنِ ناز کی کیا بات ہے، غالب!
ہم بھی گئے واں اور تری تقدیر کو رو آئے

۱۲۲

پھر، کچھ اک دل کو بیقراری ہے
سینہ جویای زخمِ کاری ہے

پھر، جگر کھودنے لگا ناخن
آمدِ فصلِ لالہ کاری ہے

پھر، اُسی بیوفا پہ مرتے ہیں
پھر، وہی زندگی ہماری ہے

بیخودی بے سبب نہیں، غالب
کچھ تو ہے، جس کی پردہ داری ہے!

۱۲۳

جنوں تہمت کشِ تسکیں نہو، گر شادمانی کی؛
نمک پاشِ خراشِ دل ہے، لذت زندگانی کی

۱۲۴

پنہاں تھا دام سخت قریب آشیان کے؛
اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوے

تیری وفا سے کیا ہو تلافی؟ کہ دہر میں
تیرے سوا بھی، ہم پہ بہت سے ستم ہوے

لکھتے رہے جنوں کی حکایاتِ خوں چکاں
ہرچند اس میں ہاتھ ہمارے قلم ہوے

نالے، عدم میں، چند ہمارے سپرد تھے
جو واں نہ کھچ سکے، سو وہ یاں آکے دم ہوے

۱۲۵

دیکھنا قسمت، کہ آپ اپنے پہ رشک آجائے ہے!
میں اُسے دیکھوں، بھلا کب مجھ سے دیکھا جائے ہے؟

غیر کو، یا رب! وہ کیونکر منعِ گستاخی کرے؟
گر حیا بھی اُس کو آتی ہے، تو شرما جائے ہے

شوق کو یہ لت کہ ہر دم نالہ کھینچے جائیے!
دل کی وہ حالت کہ دم لینے سے گھبرا جائے ہے!

دور چشمِ بد تری بزمِ طرب سے! واہ، واہ!!
نغمہ ہو جاتا ہے، واں گر نالہ میرا جائے ہے

اُسکی بزم آرائیاں سنکر، دلِ رنجور، یاں
مثلِ نقشِ مدعای غیر، بیٹھا جائے ہے

ہوکے عاشق، وہ پریرخ اور نازک بنگیا
رنگ کُھلتا جائے ہے، جتنا کہ اُڑتا جائے ہے

نقش کو اُسکے، مصور پر بھی کیا کیا ناز ہیں!
کھینچتا ہے جسقدر، اُتنا ہی کھچتا جائے ہے

۱۲۶

اُگ رہا ہے در و دیوار سے سبزہ، غالب
ہم بیاباں میں ہیں اور گھر میں بہار آئی ہے

۱۲۷

سادگی پر اُسکی، مرجانے کی حسرت دل میں ہے
بس نہیں چلتا؛ کہ پھر خنجر کفِ قاتل میں ہے
دیکھنا تقریر کی لذت کہ جو اُس نے کہا
میں نے یہ جانا کہ گویا یہ بھی میرے دل میں ہے!
گرچہ ہے کس کس برائی سے؛ ولے با ایں ہمہ
ذکر میرا مجھ سے بہتر ہے کہ اُس محفل میں ہے

۱۲۸

دل سے، تری نگاہ، جگر تک اُتر گئی
دونوں کو اک ادا میں رضامند کر گئی

شق ہو گیا ہے سینہ : خوشا لذتِ فراغ !
تکلیفِ پردہ داریء زخمِ جگر گئی

اُڑتی پھرے ہے خاک مری، کوی یار میں
بارے اب ، اے ہوا ! ہوسِ بال و پر گئی

نظارہ نے بھی کام کیا ، واں ، نقاب کا
مستی سے ، ہر نگہ ترے رخ پر بکھر گئی

فردا و دی کا تفرقہ یکبار مٹ گیا
کل تم گئے کہ ہم پہ قیامت گزر گئی

۱۲۹

اپنی گلی میں مجکو نہ کر دفن ، بعدِ قتل
میرے پتے سے، خلق کو کیوں تیرا گھر ملے؟

ساقی گری کی شرم کرو آج ؛ ورنہ ہم
ہر شب پیا ہی کرتے ہیں مے ، جسقدر ملے

لازم نہیں کہ خضر کی ہم پیروی کریں
جانا کہ اک بزرگ ہمیں ہم سفر ملے

۱۳۰

کوئی دن گر زندگانی اور ہے
اپنے جی میں ، ہم نے ٹھانی اور ہے

آتشِ دوزخ میں یہ گرمی کہاں ؟
سوزِ غمہای نہانی اور ہے

دیکھے خط ، منہ دیکھتا ہے نامہ بر
کچھ تو پیغامِ زبانی اور ہے !

قاطعِ اعمار ہیں اکثر نجوم
وہ بلای آسمانی اور ہے !

ہو چکیں، غالب، بلائیں سب تمام
ایک مرگِ ناگہانی اور ہے

۱۳۱

کوئی امید بر نہیں آتی !
کوئی صورت نظر نہیں آتی !

موت کا ایک دن معیّن ہے
نیند کیوں رات بھر نہیں آتی؟

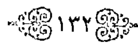
آگے، آتی تھی، حالِ دل پہ ہنسی
اب، کسی بات پر نہیں آتی!

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زہد؛
پر طبیعت ادھر نہیں آتی!

ہے کچھ ایسی ہی بات جو چپ ہوں؛
ورنہ کیا بات کر نہیں آتی؟

ہم وہاں ہیں، جہاں سے ہم کو بھی
کچھ ہماری خبر نہیں آتی!

مرتے ہیں آرزو میں مرنے کی:
موت آتی ہے، پر نہیں آتی


۱۳۲

جو نہ، نقدِ داغِ دل کی، کرے شعلہ پاسبانی
تو فسردگی نہاں ہے بہ کمینِ بیزبانی

مجھے اُس سے کیا توقع بزمانۂ جوانی ،
کبھی کودکی میں جس نے نہ سنی مری کہانی ؟

یوں ھی دکھ کسی کو دینا نہیں خوب ؛ ورنہ کہتا
کہ « مرے عدو کو، یا رب ، ملے میری زندگانی ! »

۱۳۳

ق

اے تازہ واردانِ بساطِ ہوای دل !
زنہار! اگر تمھیں ھوسِ نای و نوش ھے

دیکھو مجھے، جو دیدۂ عبرت نگاہ ھو !
میری سنو، جو گوشِ نصیحت نیوش ھے !

ساقی ، بجلوہ ، دشمنِ ایمان و آگہی
مطرب ، بہ نغمہ ، رھزنِ تمکین و ھوش ھے

یا شب کو دیکھتے تھے کہ ھر گوشۂ بساط
دامانِ باغبان و کفِ گلفروش ھے ؛

لطفِ خرامِ ساقی و ذوقِ صدای چنگ
یہ جنتِ نگاہ ، وہ فردوسِ گوش ھے

یا صبحدم جو دیکھئے آ کر، تو بزم میں
نے وہ سرور و سور، نہ جوش وخروش ھے:
داغِ فراقِ صحبتِ شب کی جلی ھوئی
اك شمع رہ گئی ھے، سو وہ بھی خموش ھے

۱۲٤

آ، کہ مری جان کو قرار نہیں ھے!
طاقتِ بیدادِ انتظار نہیں ھے!
دیتے ھیں جنت، حیاتِ دھر کے بدلے:
نشّہ باندازۂ خمار نہیں ھے
گریہ نکالے ھے تری بزم سے مجکو
ھائے، کہ رونے پہ اختیار نہیں ھے!
قتل کا میرے، کیا ھے عہد تو، بارے
وائے! اگر عہد استوار نہیں ھے
تو نے قسم میکشی کی کھائی ھے، غالب؟
تیری قسم کا کچھ اعتبار نہیں ھے

۱۳۵

ھجومِ غم سے، یاں تک سرنگونی مجکو حاصل ھے
کہ تارِ دامن و تارِ نظر میں فرق مشکل ھے

۱۳۶

ھوں سراپا سازِ آھنگِ شکایت، کچھ نہ پوچھ
ھے یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑے تو مجھے

۱۳۷

جس بزم میں، تو ناز سے گفتار میں آوے
جاں، کالبدِ صورتِ دیوار میں آوے

سایہ کی طرح، ساتھ پھریں سرو و صنوبر
تو، اس قدِ دلکش سے، جو گلزار میں آوے

اُس چشمِ فسونگر کا اگر پائے اشارہ
طوطی کی طرح، آئنہ گفتار میں آوے

مرجاؤں نہ کیوں رشک سے؟ جب وہ تنِ نازک
آغوشِ خمِ حلقۂ زنار میں آوے

تب چاکِ گریباں کا مزا ہے ، دلِ نالاں !
جب اک نفس اُلجھا ہوا ہر تار میں آوے

۱۳۸

حسنِ مہ گرچہ ، بہ ہنگامِ کمال ، اچھا ہے
اُس سے میرا مہِ خرشید جمال اچھا ہے

بوسہ دیتے نہیں اور دل پہ ہے ہر لحظہ نگاہ :
جی میں کہتے ہیں کہ «مفت آئے، تو مال اچھا ہے»

اور بازار سے لے آئے ، اگر ٹوٹ گیا :
ساغرِ جم سے مرا جامِ سفال اچھا ہے

اُنکے دیکھے سے ، جو آ جاتی ہے منہ پر رونق
وہ سمجھتے ہیں کہ بیمار کا حال اچھا ہے !

ہم کو معلوم ہے جنت کی حقیقت ؛ لیکن
دلکے خوش رکھنے کو ، غالب ، یہ خیال اچھا ہے

۱۳۹

نہوئی گر مرے مرنے سے تسلی ، نہ سہی
امتحاں اور بھی باقی ہو ، تو یہ بھی نہ سہی

مَی‌پرستاں ! خمِ مَی منہ سے لگائے ھی بنے
ایك دن گر نہ ھوا بزم میں ساقی ، نہ سہی

۱٤۰

عجب نشاط سے ، جلاد کے ، چلے ھیں ہم ، آگے
کہ اپنے سایہ سے ، سر ، پانو سے ھے دو قدم آگے !

قضا نے تھا مجھے چاھا خرابِ بادۂ الفت
فقط خراب لکھا ، بس نہ چل سکا قلم آگے

خدا کیواسطے ! داد اس جنونِ شوق کی دینا
کہ اُسکے در پہ پہنچتے ھیں نامہ‌بر سے ہم آگے

قسم جنازہ پہ آنے کی میرے کھاتے ھیں ، غالب
ہمیشہ کھاتے تھے جو میری جان کی قسم ، آگے !

۱٤۱

شکوہ کے نام سے ، بیمہر خفا ہوتا ہے
یہ بھی مت کہ ؛ کہ جو کہیے ، تو گلا ہوتا ہے

پُرہوں میں شکوہ سے یوں ، راگ سے جیسے باجا
اك ذرا چھیڑیئے ، پھر دیکھئے ، کیا ہوتا ہے؟

کیوں نہ ٹھہریں ہدفِ ناوكِ بیداد ؛ کہ ہم
آپ اُٹھا لاتے ہیں ، گر تیر خطا ہوتا ہے ؟

خوب تھا ، پہلے سے ہوتے جو ہم اپنے بدخواہ ؛
کہ بھلا چاہتے ہیں اور برا ہوتا ہے

نالہ جاتا تھا پرے عرش سے میرا ، اور اب
لب تك آتا ہے ، جو ایسا ہی رسا ہوتا ہے

۱٤۲

ہر ایك بات پہ کہتے ہو تم کہ « تو کیا ہے ؟ »
تمھیں کہو کہ یہ اندازِ گفتگو کیا ہے

نہ شعلہ میں یہ کرشمہ ، نہ برق میں یہ ادا
کوئی بتاؤ کہ وہ شوخِ تندخو کیا ہے ؟

چپک رہا ہے ، بدن پر لہو سے ، پیراہن
ہمارے جیب کو ، اب حاجتِ رفو کیا ہے ؟

جلا ہے جسم جہاں ، دل بھی جل گیا ہوگا
کریدتے ہو جو اب راکھ ، جستجو کیا ہے ؟

رگوں میں دوڑتے پھرنے کے ہم نہیں قایل
جب آنکھ سے ہی نہ ٹپکا ، تو پھر لہو کیا ہے !

وہ چیز ، جس کیلئے ہم کو ہو بہشت عزیز
سوای بادۂ گلفامِ مشکبو ، کیا ہے ؟

پیوں شراب ، اگر خم بھی دیکھ لوں دو چار
یہ شیشہ و قدح و کوزہ و سبو کیا ہے ؟

رہی نہ طاقتِ گفتار ، اور اگر ہو بھی
تو کس امید پہ کہیے کہ آرزو کیا ہے ؟

۱٤۳

مین اُنھیں چھیڑوں اور کچھ نہ کہیں !
چل نکلتے ، جو مے پئے ہوتے

قہر ہو ، یا بلا ہو : جو کچھ ہو
کاشکے ! تم مرے لئے ہوتے !

میری قسمت میں ، غم گر اتنا تھا
دل بھی ، یا رب کئی دئے ہوتے !

آ ہی جاتا وہ راہ پر ، غالب
کوئی دن اور بھی جئے ہوتے !

۱٤٤

خط لکھیں گے ، گرچہ مطلب کچھہ نہ ہو
ہم تو عاشق ہیں ، تمھارے نام کے

عشق نے ، غالب ، نِکمّا کر دیا ؛
ورنہ ، ہم بھی آدمی تھے کام کے

۱۴۵

پھر اس انداز سے بہار آئی
کہ ھوے مہر و مہ تماشائی

دیکھو، اے ساکنانِ خطۂ خاک!
اسکو کہتے ھیں عالم آرائی:

کہ زمیں ھو گئی ھے، سرتاسر
روکشِ سطحِ چرخِ مینائی

سبزہ کو جب کہیں جگہ نہ ملی
بن گیا روی آب پر کائی

۱۴۶

تغافل دوست ھوں، میرا دماغِ عجز عالی ھے
اگر پہلوتہی کیجے، تو جا میری بھی خالی ھے

رھا آباد عالم، اھلِ ھمت کے نہ ھونے سے
بھرے ھیں جسقدر جام و سبو، میخانہ خالی ھے

۱٤۷

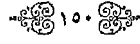
خلشِ غمزۂ خونریز نہ پوچھ
دیکھ خونابہ فشانی میری !
کیا بیاں کر کے مرا، روئیں گے یار؟
مگر آشفتہ بیانی میری
متقابل ہے، مقابل میرا
رك گیا، دیکھ روانی میری
دَہَن اُس کا جو نہ معلوم ہوا
کُھل گئی ہیچمدانی میری

۱٤۸

از بسکہ، سکھاتا ہے غم ضبط کے اندازے
جو داغ نظر آیا، اك چشم نمائی ہے

۱٤۹

اچھا ہے سرانگشتِ حنائی کا تصور
دل میں نظر آتی تو ہے، اك بوند لہو کی !



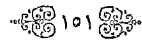
چاھئے اچھوں کو ، جتنا چاھئے
یہ اگر چاھیں ، تو پھر کیا چاھئے !

چاھنے کو تیرے کیا سمجھا تھا دل ؟
بارے ، اب اس سے بھی سمجھا چاھئے

دوستی کا پردہ ھے ، بیگانگی
منہ چھپانا ھم سے چھوڑا چاھئے

دشمنی نے میری کھویا غیر کو
کسقدر دشمن ھے ، دیکھا چاھئے !

منحصر مرنے پہ ھو جس کی امید
ناامیدی اُس کی دیکھا چاھئے



ھر قدم ، دوریء منزل ھے نمایاں مجھ سے
میری رفتار سے بھاگے ھے ، بیاباں مجھ سے

وحشتِ آتشِ دل سے، شبِ تنہائی میں
صورتِ دود، رہا سایہ گریزاں مجھ سے

شوقِ دیدار میں، گر تو مجھے گردن مارے
ہو نگہ، مثلِ گلِ شمع، پریشاں مجھ سے

بیکسیہای شبِ ہجر کی وحشت، ہے، ہے!!
سایہ، خرشیدِ قیامت میں ہے پنہاں مجھ سے

۱۵۲

نکتہ چیں ہے؛ غمِ دل اُس کو سنائے نہ بنے
کیا بنے بات، جہاں بات بنائے نہ بنے؟

میں بلاتا تو ہوں اُس کو، مگر اے جذبۂ دل!
اُس پہ بنجائے کچھ ایسی کہ بن آئے نہ بنے

کھیل سمجھا ہے؛ کہیں چھوڑ ندے، بھول نجائے:
کاش! یوں بھی ہو کہ بن میرے ستائے نہ بنے

غیر پھرتا ہے، لیے یوں ترے خط کو، کہ اگر
کوئی پوچھے کہ یہ کیا ہے، تو چھپائے نہ بنے

اس نزاکت کا برا ہو! وہ بھلے ہیں تو کیا؟
ہاتھ آویں، تو اُنھیں ہاتھ لگائے نہ بنے

کہہ سکے کون کہ یہ جلوہ گری کس کی ہے؟
پردہ چھوڑا ہے وہ، اُس نے، کہ اُٹھائے نہ بنے

۱۵۳

چاک کی خواہش، اگر وحشت بعریانی کرے
صبح کی مانند، زخمِ دل گریبانی کرے

خطِ عارض سے لکھا ہے، زلف کو الفت نے، عہد
یکقلم منظور ہے، جو کچھ پریشانی کرے

۱۵٤

وہ آکے خواب میں، تسکینِ اضطراب تو دے؛
ولے مجھے، تپشِ دل مجالِ خواب تو دے

کرے ہے قتل، لگاوٹ میں تیرا رو دینا!
تری طرح، کوئی تیغِ نگہ کو آب تو دے!

دکھا کے جنبشِ لب ہی ، تمام کر ہم کو
نہ دے جو بوسہ، تو مُنہ سے کہیں جواب تو دے

پلادے اوک سے ، ساقی ، جو ہم سے نفرت ہے :
پیالہ گر نہیں دیتا ، نہ دے ، شراب تو دے !

۱۵۵

تپش سے میری ، وقفِ کشمکش ہر تارِ بستر ہے
مرا سر رنجِ بالیں ہے ، مرا تن بارِ بستر ہے

سرشکِ سر بصحرا دادہ ، نورالعینِ دامن ہے
دلِ بیدست و پا افتادہ ، برخوردارِ بستر ہے

خوشا اقبالِ رنجوری ! عیادت کو تم آئے ہو:
فروغِ شمعِ بالیں ، طالعِ بیدارِ بستر ہے

بطوفانگاہِ جوشِ اضطرابِ شامِ تنہائی ،
شعاعِ آفتابِ صبحِ محشر ، تارِ بستر ہے

ابھی آتی ہے بو ، بالش سے ، اُسکی زلفِ مشکیں کی
ہماری دید کو ، خوابِ زلیخا عارِ بستر ہے!

کہوں کیا، دل کی کیا حالت ہے ہجرِ یار میں، غالب؟
کہ بیتابی سے، ہر اک تارِ بستر خارِ بستر ہے

۱۵۶

سمجھ اس فصل میں کوتاہیء نشو و نما، غالب
اگر گل، سرو کی قامت پہ، پیراہن نہ ہو جاوے

۱۵۷

فریاد کی کوئی لے نہیں ہے:
نالہ پابندِ نے نہیں ہے

ہرچند، ہر ایک شے میں تو ہے؛
پر تجھ سے کوئی شے نہیں ہے

ہاں! کھائیو مت فریبِ ہستی:
ہرچند، کہیں کہ «ہے»، نہیں ہے

کیوں ردّ ِ قدح کرے ہے، زاہد؟
مے ہے: یہ مگس کی قے نہیں ہے

ہستی ہے، نہ کچھ عدم ہے، غالب
آخر تو کیا ہے؟ اے نہیں، ہے!

۱۵۸

نہ پوچھ نسخۂ مرہم، جراحتِ دل کا
کہ اُس میں ریزۂ الماس جزوِ اعظم ہے

بہت دنوں میں، تغافل نے تیرے پیدا کی
وہ اک نگہ، کہ بظاہر نگاہ سے کم ہے

۱۵۹

ہم رشک کو اپنے بھی گوارا نہیں کرتے:
مرتے ہیں؛ و لے اُن کی تمنا نہیں کرتے

۱۶۰

کیوں نہو چشمِ بتاں محوِ تغافل، کیوں نہو؟
یعنی اس بیمار کو نظارہ سے پرہیز ہے

مرتے مرتے، دیکھنے کی آرزو رہجائیگی
وائے ناکامی! کہ اُس کافر کا خنجر تیز ہے

۱٦۱

دیا ہے دل اگر اُس کو، بشر ہے، کیا کہیے؟
ہوا رقیب، تو ہو، نامہ بر ہے، کیا کہیے؟

یہ ضد کہ آج نہ آوے اور آئے بن نہ رہے
قضا سے شکوہ ہمیں کسقدر ہے، کیا کہیے؟

زہے کرشمہ! کہ یوں دے رکھا ہے ہم کو فریب
کہ بن کہے بھی اُنہیں سب خبر ہے، کیا کہیے؟

سمجھ کے کرتے ہیں، بازار میں وہ، پرسشِ حال
کہ یہ کہے کہ «سرِ رہگزر ہے، کیا کہیے؟»

اُنہیں سوال پہ زعمِ جنوں ہے، کیوں لڑیے؟
ہمیں جواب سے قطعِ نظر ہے، کیا کہیے؟

۱٦۲

دیکھ کر در پردہ گرمِ دامن افشانی مجھے،
کر گئی وابستۂ تن، میری عریانی مجھے

کیوں نہو بے التفاتی ؟ اُس کی خاطر جمع ہے
جانتا ہے محوِ پرسشہای پنہانی مجھے !

میرے غمخانے کی قسمت جب رقم ہونے لگی
لکھدیا منجملۂ اسبابِ ویرانی مجھے !

وعدہ آنے کا وفا کیجے ؛ یہ کیا انداز ہے ؟
تم نے کیوں سونپی ہے، میرے گھر کی دربانی، مجھے ؟

۱٦۳

یاد ہے، شادی میں بھی ہنگامۂ «یا رب»، مجھے
سُبحۂ زاهد ہوا ہے ، خندہ زیرِ لب مجھے

۱٦٤

قد و گیسو میں قیس و کوہ‌کن کی آزمایش ہے
جہاں ہم ہیں ، وہاں دار و رسن کی آزمایش ہے

کریں گے کوہ‌کن کے حوصلے کا امتحاں آخر
ہنوز، اُس خستہ کے نیروی تن کی آزمایش ہے

وہ آیا بزم میں ؛ دیکھو، نہ کہیو پھر کہ «غافل تھے»
شکیب و صبرِ اہلِ انجمن کی آزمایش ہے

رگ و پے میں جب اُترے زہرِ غم، تب دیکھیے کیا ہو
ابھی تو تلخیِ کام و دہن کی آزمایش ہے

۱۶۵

کبھی، نیکی بھی اُس کے جی میں گر آجائے ہے، مجھ سے
جفائیں کر کے اپنی یاد ، شرما جائے ہے مجھ سے

خدایا ! جذبۂ دل کی مگر تاثیر اُلٹی ہے؛
کہ جتنا کھینچتا ہوں اور کھچتا جائے ہے مجھ سے؟

تکلف بر طرف ! نظارگی میں بھی سہی ؛ لیکن
وہ دیکھا جائے ، کب یہ ظلم دیکھا جائے ہے مجھ سے؟

قیامت ہے کہ ہووے مدعی کا ہم سفر، غالب !
وہ کافر، جو خدا کو بھی نہ سونپا جائے ہے مجھ سے!

۱٦٦

لاغر اتنا ہوں کہ گر تو بزم میں جا دے مجھے
میرا ذمہ ، دیکھکر گر کوئی بتلا دے مجھے

یاں تلک میری گرفتاری سے وہ خوش ہے کہ میں
زلف گر بنجاؤں ، تو شانے میں اُلجھا دے مجھے

۱٦۷

بازیچۂ اطفال ہے دنیا ، مرے آگے!
ہوتا ہے شب و روز تماشا ، مرے آگے!

اک کھیل ہے اورنگِ سلیماں ، مرے نزدیک؛
اک بات ہے اعجازِ مسیحا ، مرے آگے!

جز نام ، نہیں صورتِ عالم مجھے منظور!
جز وہم ، نہیں ہستیء اشیا ، مرے آگے!

ہوتا ہے نہاں گرد میں صحرا ، مرے ہوتے
گِھستا ہے جبیں خاک پہ دریا ، مرے آگے!

مت پوچھ کہ کیا حال ہے میرا ترے پیچھے
تو دیکھ کہ کیا رنگ ہے تیرا مرے آگے!

ایماں مجھے روکے ہے، تو کھینچے ہے مجھے کفر:
کعبہ مرے پیچھے ہے، کلیسا مرے آگے!

عاشق ہوں، پہ معشوق فریبی ہے مرا کام
مجنوں کو برا کہتی ہے لیلا، مرے آگے

خوش ہوتے ہیں، پر وصل میں یوں مر نہیں جاتے!
آئی شبِ ہجراں کی تمنا، مرے آگے

ہے موجزن ایک قلزمِ خوں؛ کاش! یہی ہو
آتا ہے ابھی، دیکھیے، کیا کیا، مرے آگے؟

گو ہاتھ کو جنبش نہیں، آنکھوں میں تو دم ہے
رہنے دو ابھی ساغر و مینا مرے آگے!

۱۶۸

کہوں جو حال، تو کہتے ہو، «مدعا کہیے»
تمھیں کہو کہ جو تم یوں کہو تو کیا کہیے؟

نہ کہیو طعن سے پھر تم کہ « ہم ستمگر ہیں »
مجھے تو خو ہے کہ جو کچھ کہو « بجا کہیے »

نہیں ذریعۂ راحت ، جراحتِ پیکاں
وہ زخمِ تیغ ہے ، جس کو کہ دلکشا کہیے

جو مدعی بنے ، اُس کے نہ مدعی بنیے
جو ناسزا کہے ، اُس کو نہ ناسزا کہیے

کہیں ، حقیقتِ جانکاہیء مرض لکھیے
کہیں ، مصیبتِ ناسازیء دوا کہیے

کبھی ، شکایتِ رنجِ گراں نشیں کیجے
کبھی ، حکایتِ صبرِ گریزپا کہیے

رہے نہ جان ، تو قاتل کو خوں بہا دیجے
کٹے زبان ، تو خنجر کو « مرحبا » کہیے

نہیں نگار کو الفت : نہو ، نگار تو ہے :
روانیء روش و مستیء ادا کہیے

نهیں بہار کو فرصت ؛ نہو، بہار تو ھے :
طراوتِ چمن و خوبیء ھوا کہیے

سفینہ جب که کنارے په آ لگا ، غالب
خدا سے ، کیا ستم و جورِ ناخدا کہیے ؟

۱٦۹

رونے سے ، اور عشق میں بیباك ھو گئے
دھوئے گئے ھم اتنے که بس پاك ھو گئے !

صرفِ بہای مے ھوے ، آلاتِ میکشی
تھے یه ھی دو حساب ، سو یوں پاك ھو گئے

کرنے گئے تھے اُس سے تغافل کا ، ھم ، گلا
کی ایك ھی نگاہ که بس خاك ھو گئے !

۱۷۰

عرضِ نازِ شوخیء دنداں ، برای خندہ ھے
دعوی جمعیتِ احباب ، جای خندہ ھے

شورشِ باطن کے هیں احباب منکر؛ ورنہ یاں
دل محیطِ گریہ و لب آشنای خندہ ہے

۱۷۱

جبتک دہانِ زخم نہ پیدا کرے کوئی
مشکل کہ تجھسے راہِ سخن وا کرے کوئی

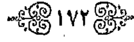
افسردگی ، نہیں طرب انشای التفات
هاں! درد بنکے، دل میں مگر جا کرے کوئی

چاكِ جگر سے ، جب رہِ پرسش نہ وا ہوئی
کیا فایدہ کہ جیب کو رسوا کرے کوئی؟

ناکامیِ نگاہ ، ہے برقِ نظارہ سوز
تو وہ نہیں کہ تجکو تماشا کرے کوئی

سر بر ہوئی نہ وعدۂ صبر آزما سے ، عمر
فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی؟

بیکاریِ جنوں کو ہے سر پیٹنے کا شُغل
جب ہاتھ ٹوٹ جائیں، تو پھر کیا کرے کوئی



ابنِ مریم ہوا کرے کوئی
میرے دکھ کی دوا کرے کوئی

شرع و آئین پر مدار سہی
ایسے قاتل کا کیا کرے کوئی؟

چال جیسے کڑی کمان کا تیر
دل میں ایسے کے جا کرے کوئی!

بات پر واں زبان کٹتی ہے
وہ کہیں اور سنا کرے کوئی

بک رہا ہوں جنوں میں کیا کیا کچھ
کچھ نہ سمجھے، خدا کرے! کوئی

کیا کیا خضر نے سکندر سے!
اب کسے رہنما کرے کوئی؟

۱۷۳

تمھاری طرز و روش ، جانتے ھیں ھم ، کیا ھے ؟
رقیب پر ھے اگر لطف ، تو ستم کیا ھے ؟

سخن میں خامۂ غالب کی آتش افشانی
یقیں ھے ھم کو بھی ، لیکن اب اُس میں دم کیا ھے

۱۷۴

باغ ، پا کر خفقانی ، یہ ڈراتا ھے مجھے :
سایۂ شاخِ گل ، افعی نظر آتا ھے مجھے

زندگی میں تو وہ محفل سے اُٹھا دیتے تھے
دیکھوں ، اب مر گئے پر ، کون اٹھاتا ھے مجھے؟

۱۷۵

بھوکے نہیں ھیں سیرِ گلستاں کے ھم ؛ ولے
کیوں کر نہ کھائیے ، کہ ھوا ھے بہار کی ؟

۱۷۶

ھزاروں خواھشیں ایسی کہ ھر خواھش پہ دم نکلے!
بہت نکلے مرے ارمان، لیکن پھر بھی کم نکلے!

ڈرے کیوں میرا قاتل؟ کیا رھیگا اُسکی گردن پر
وہ خوں، جو چشمِ تر سے، عمر بھر یوں دمبدم نکلے؟

نکلنا خلد سے آدم کا سنتے آئے ھیں؛ لیکن
بہت بے آبرو ھو کر، ترے کوچے سے ھم نکلے!

بھرم کُھل جائے، ظالم، تیرے قامت کی درازی کا
اگر اس طرۂ پرپیچ و خم کا پیچ و خم نکلے

مگر لکھوائے کوئی اُس کو خط، تو ھم سے لکھوائے
ھوئی صبح اور گھر سے، کان پر رکھ کر قلم، نکلے

ھوئی، اس دور میں، منسوب مجھ سے بادہ آشامی
پھر آیا وہ زمانہ، جو جہاں میں جامِ جم نکلے

ھوئی جن سے توقع خستگی کی داد پانے کی
وہ ھم سے بھی زیادہ خستۂ تیغِ ستم نکلے

محبت میں ، نہیں ہے فرق جینے اور مرنے کا
اُسی کو دیکھ کر جیتے ہیں ، جس کافر پہ دم نکلے!

کہاں میخانہ کا دروازہ ، غالب ، اور کہاں واعظ!
پر اتنا جانتے ہیں ، کل وہ جاتا تھا کہ ہم نکلے

۱۷۷

جز زخمِ تیغِ ناز ، نہیں دل میں آرزو
جیبِ خیال بھی ترے ہاتھوں سے چاک ہے

۱۷۸

لبِ عیسیٰ کی جنبش کرتی ہے گہوارہ جنبانی
قیامت ، کشتۂ لعلِ بتاں کا خوابِ سنگیں ، ہے!

۱۷۹

آمدِ سیلابِ طوفانِ صدای آب ہے
نقشِ پا جو ، کان میں رکھتا ہے انگلی ، جادہ سے

۱۸۰

ھوں میں بھی تماشائیٔ نیرنگِ تمنا
مطلب نہیں کچھ اس سے کہ مطلب ھی بر آوے

۱۸۱

سیاھی جیسے گر جاوے دمِ تحریر کاغذ پر
مری قسمت میں، یوں تصویر ھے شبہای ھجراں کی

۱۸۲

دل و دیں نقد لا، ساقی سے گر سودا کیا چاھے
کہ اس بازار میں، ساغر متاع دست گرداں ھے

غم، آغوشِ بلا میں پرورش دیتا ھے عاشق کو
چراغِ روشن اپنا، قلزمِ صرصر کا مرجاں ھے

۱۸۳

دل مدعی و دیدہ بنا مدعیٰ علیہ
نظارہ کا مقدمہ، پھر، روبکار ھے

پیچ آپڑی ہے وعدۂ دلدار کی، مجھے
وہ آئے یا نہ آئے، پہ یاں انتظار ہے

غفلت کفیلِ عمر و اسد ضامنِ نشاط
اے مرگِ ناگہاں، تجھے کیا انتظار ہے؟

۱۸۴

آئینہ کیوں ندوں کہ تماشا کہیں جسے؟
ایسا کہاں سے لاؤں کہ تجسا کہیں جسے؟

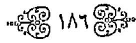
غالب، برا نمان، جو واعظ برا کہے
ایسا بھی کوئی ہے کہ سب اچھا کہیں جسے؟

۱۸۵

شعلے سے نہوتی، ہوسِ شعلہ نے جو کی
جی، کسقدر افسردگیء دل پہ جلا ہے؟

اے پرتوِ خرشیدِ جہانتاب، ادھر بھی!
سایہ کی طرح، ہم پہ عجب وقت پڑا ہے!

نا کردہ گناہوں کی بھی حسرت کی ملے داد
یا رب ، اگر ان کردہ گناہوں کی سزا ہے!



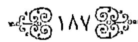
۱۸٦

اک خوں چکاں کفن میں کڑوڑوں بناؤ ہیں
پڑتی ہے آنکھ ، تیرے شہیدوں پہ ، حور کی

واعظ ، نہ تم پیو ، نہ کسی کو پلا سکو
کیا بات ہے تمھاری شرابِ طہور کی!

گو واں نہیں ، پہ واں کے نکالے ہوے تو ہیں
کعبہ سے ، ان بتوں کو بھی نسبت ہے دور کی

کیا فرض ہے کہ سب کو ملے ایک سا جواب؟
آؤ نہ ، ہم بھی سیر کریں کوہِ طور کی!



۱۸۷

غم کھانے میں بودا ، دلِ ناکام ، بہت ہے
یہ رنج ، کہ کم ہے مَیء گلفام ، بہت ہے

کہتے ہوے ساقی سے حیا آتی ہے ؛ ورنہ
ہے یوں کہ مجھے دُردِ تہِ جام بہت ہے

زمزم ہی پہ چھوڑو؛ مجھے کیا طوفِ حرم سے؟
آلودہ بہ مے، جامۂ احرام، بہت ہے

ہوگا کوئی ایسا بھی کہ غالب کو نجانے؟
شاعر تو وہ اچھا ہے، پہ بدنام بہت ہے


۱۸۸

مدت ہوئی ہے، یار کو مہماں کیے ہوے
جوشِ قدح سے، بزم چراغاں کیے ہوے

کرتا ہوں جمع، پھر، جگرِ لخت لخت کو
عرصہ ہوا ہے، دعوتِ مژگاں کیے ہوے

مانگے ہے، پھر، کسی کو لبِ بام پر، ہوس
زلفِ سیاہ رخ پہ پریشاں کیے ہوے

چاہے ہے، پھر، کسی کو مقابل میں، آرزو
سرمہ سے، تیز دَشنۂ مژگاں کیے ہوے

اک نوبہارِ ناز کو تاکے ہے، پھر، نگاہ
چہرہ، فروغِ مے سے، گلستاں کیے ہوے
پھر، جی میں ہے کہ در پہ کسی کے پڑے رہیں
سر زیرِ بارِ منتِ درباں کیے ہوے
غالب، ہمیں نچھیڑ؛ کہ پھر، جوشِ اشک سے،
بیٹھے ہیں ہم، تہیّۂ طوفان کیے ہوے

۱۸۹

نویدِ امن ہے، بیدادِ دوست، جاں کیلیے!
رہی نہ طرزِ ستم کوئی، آسماں کیلیے
بلا سے، گر مژۂ یار تشنۂ خوں ہے!
رکھوں کچھ اپنی بھی مژگانِ خوں فشاں کیلیے
وہ زندہ ہم ہیں کہ ہیں روشناسِ خلق، اے خضر!
نہ تم، کہ چور بنے عمرِ جاوداں کیلیے
مثال یہ مری کوشش کی ہے: کہ مرغِ اسیر
کرے قفس میں فراہم خس، آشیاں کیلیے

گدا سمجھ کے ، وہ چپ تھا ؛ مری جو شامت آئے
اُٹھا اور اُٹھ کے قدم ، میں نے ، پاسباں کے ، لیے

ادای خاص سے ، غالب ہوا ہے نکتہ سرا
صَلای عام ہے ، یارانِ نکتہ داں کیلئے



قصائد

سازِ یك ذره نہیں ، فیضِ چمن سے ، بیکار
سایۂ لالۂ بیداغ ، سویدای بہار

سبز ہے ، جامِ زمرد کیطرح ، داغِ پلنگ
تازہ ہے ، ریشۂ نارنج صفت ، روی شرار

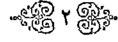
کاٹ کر پھینکیے ناخن ، تو باندازِ ھلال
قوتِ نامیہ اُسکو بھی نچھوڑے بیکار

لعل سی ، کی ھے ، پیء زمزمۂ مدحتِ شاہ
طوطیء سبزۂ کہسار نے پیدا منقار

وہ شہنشاہ ، کہ جسکی ، پیء تعمیرِ سرا
چشمِ جبریل ، ہوئی قالبِ خشتِ دیوار

فلك العرش ، ھجومِ خمِ دوشِ مزدور
رشتۂ فیضِ ازل ، سازِ طنابِ معمار

واں کی خاشاك سے حاصل ہو جسے یك پرِکاہ
وہ رھے مِروحۂ بالِ پری سے بیزار



دهر جز جلوهٔ یکتائیء معشوق نہیں
ہم کہاں ہوتے ، اگر حسن نہوتا خود بیں؟

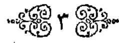
بیدلیهای تماشا ! کہ نہ عبرت ہے ، نہ ذوق
بیکسیہای تمنا ! کہ نہ دنیا ہے ، نہ دیں

ہرزہ ہے ، نغمۂ زیر و بمِ ہستی و عدم
لغو ہے ، آئنۂ فرقِ جنون و تمکیں

مثلِ مضمونِ وفا ، باد بدستِ تسلیم !
صورتِ نقشِ قدم ، خاك بفرقِ تمکیں !

کس نے دیکھا نفسِ اهلِ وفا آتش خیز ؟
کس نے پایا اثرِ نالۂ دلهای حزیں ؟

سامعِ زمزمۂ اهلِ جہاں ہوں ؛ لیکن
نہ سر و برگِ ستایش ، نہ دماغِ نفریں



ہاں ، مہِ نو ، سنیں ہم اُسکا نام
جس کو تو، جھك کے، کر رہا ہے سلام

دو دن آیا ہے تو نظر دمِ صبح
یہی انداز اور یہی اندام

بارے ، دو دن کہاں رہا غایب ؟
بندہ عاجز ہے ، گردشِ ایام

اُڑ کے جاتا کہاں ؟ کہ تاروں کا
آسماں نے بچھا رکھا تھا ، دام

مرحبا ! اے سرورِ خاصِ خواص
حبّذا ! اے نشاطِ عامِ عوام

عذر میں ، تین دن نہ آنے کے
لیکے آیا ہے عید کا پیغام

ایك میں کیا ، کہ سب نے جان لیا
تیرا آغاز اور ترا انجام

جانتا ہوں کہ آج دنیا میں
ایک ھی ہے امیدگاہِ آنام

میں نے مانا کہ تو ہے حلقہ‌بگوش
غالب اُسکا مگر نہیں ہے غلام ؟

جانتا ہوں کہ جانتا ہے تو
تب کہا ہے بطرزِ استفہام

مہرِ تاباں کو ھو ، تو ھو ، اے ماہ
قربِ ھر روزہ بر سبیلِ دوام

تجکو کیا پایہ روشناسی کا
جز بتقریبِ عیدِ ماہِ صیام ؟

جانتا ہوں کہ اُسکے فیض سے تو
پھر بنا چاھتا ہے ماہِ تمام

ماہ بن ، ماھتاب بن ، میں کون ؟
مجکو کیا بانٹ دیگا تو انعام ؟

میرا اپنا جدا معاملہ ہے
اور کے لین دین سے کیا کام ؟

ہے مجھے آرزوی بخششِ خاص
گر تجھے ہے امیدِ رحمتِ عام

جو کہ بخشیگا تجھ کو فرِّ فروغ
کیا نہ دیگا مجھے مئ گلفام ؟

ق

جب کہ چودہ منازلِ فلکی
کر چکے قطع ، تیری تیزئ گام

تیرے پرتو سے ہوں فروغ پزیر
کوی و مُشکوی و صحن و منظر و بام

دیکھنا میرے ہاتھ میں ، لبریز
اپنی صورت کا اک بلوریں جام

پھر غزل کی روش پہ چل نکلا
توسنِ طبع چاہتا تھا لگام

غزل

زہرِ غم کر چکا تھا میرا کام
تجھکو کس نے کہا کہ ہو بدنام؟

مے ھی، پھر، کیوں نہ میں پیے جاؤں
غم سے جب ہو گئی ہو زیست حرام؟

بوسہ کیسا؟ یہی غنیمت ھے
کہ نہ سمجھیں وہ لذتِ دشنام

چھیڑتا ہوں کہ اُن کو غصہ آئے
کیوں رکھوں، ورنہ، غالب اپنا نام؟

کہَ چکا میں تو سب کچھ، اب تو کہَ
اے پریچہرہ پیکِ تیز خرام

کون ھے؟ جس کے در پہ ناصیہ سا
ھیں مہ و مہر و زھرہ و بہرام

تو نہیں جانتا، تو مجھ سے سن
نامِ شاھنشہِ بلند مقام

قبلۂ چشم و دل بہادر شاہ
مظہرِ ذو الجلالِ و الاکرام

شہسوارِ طریقۂ انصاف
نوبہارِ حدیقۂ اسلام

جسکا ہر فعل ، صورتِ اعجاز
جسکا ہر قول ، معنیء الہام

بزم میں ، میزبانِ قیصر و جم
رزم میں ، اوستادِ رستم و سام

اے ترا لطف زندگی افزا !
اے ترا عہد فرخی فرجام

چشمِ بد دور ! خسروانہ شکوہ
لوحش اللہ ! عارفانہ کلام

جاں نثاروں میں تیرے ، قیصرِ روم
جرعہ خواروں مین تیرے ، مرشدِ جام

ق

مرحبا ! موشگافیِ ناوَک
آفریں ! آبداریِ صمصام

تیر کو تیرے ، تیرِ غیر ہدف
تیغ کو تیری ، تیغِ خصم نیام

ق

رعد کا کر رہی ہے کیا دم بند ؟
برق کو دیرہا ہے کیا الزام ؟

تیرے فیلِ گراں جسد کی صدا
تیرے رخشِ سبک عناں کا خرام

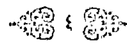
ق

فنِ صورتگری میں تیرا گرز
گر نہ رکھتا ہو دستگاہِ تمام

اُس کے مضروب کے سروتن سے
کیوں نمایاں ہو صورتِ ادغام ؟

جب ازل میں رقم پزیر ہوے
صفحہ‌ہای لیالی و ایام

اور اُن اوراق میں ، بہ کلکِ قضا
مجملًا مندرج ہوئے ، احکام
تیری توقیعِ سلطنت کو بھی
دی ، بدستور ، صورتِ ارقام
کاتبِ حکم نے ، بموجبِ حکم
اُس رقم کو دیا طرازِ دوام
ہے ازل سے روائیء آغاز
ہو ابد تک رسائیء انجام!



صبحدم ، دروازۂ خاور کھلا
مہرِ عالمتاب کا منظر کھلا
خسروِ انجم کے آیا صرف میں
شب کو تھا ، گنجینۂ گوہر، کھلا
وہ بھی تھی اک سیمیا کی سی نمود
صبح کو رازِ مہ و اختر کھلا

ہیں کواکب کچھ، نظر آتے ہیں کچھ
دیتے ہیں دھوکا ، یہ بازیگر ، کھلا

سطحِ گردوں پر پڑا تھا رات کو
موتیوں کا ، ہر طرف ، زیور کھلا

صبح آیا جانبِ مشرق نظر
اک نگارِ آتشیں رخ ، سر کھلا

تھی نظر بندی ؛ کیا جب ردِ سحر
بادۂ گلرنگ کا ساغر کھلا

لا کے ساقی نے ، صبوحی کیلیے
رکھدیا ہے ، ایک جامِ زر کھلا

بزمِ سلطانی ہوئی آراستہ
کعبۂ امن و اماں کا در کھلا

تاجِ زریں ، مہرِ تاباں سے سوا
خسروِ آفاق کے مُنہ پر کھلا

شاہِ روشن دل ، بہادر شہ ، کہ ہے
رازِ ہستی ، اُس پہ سرتاسر کھلا

وہ کہ جس کی صورتِ تکوین میں
مقصدِ نہ چرخ و ہفت اختر کھلا

وہ کہ جس کے ناخنِ تاویل سے
عقدۂ احکامِ پیغمبر کھلا

مجھ پہ ، فیضِ تربیت سے شاہ کے
منصبِ مہر و مہ و محور کھلا

لاکھ عقدے دل میں تھے؛ لیکن ہر ایک
میری حدِ وسع سے باہر کھلا

تھا دلِ وابستہ قفلِ بے کلید
کسنے کھولا؟ کب کھلا؟ کیونکر کھلا؟

باغِ معنی کی ، دکھا دوں گا ، بہار
مجھ سے ، گر شاہِ سخن گستر ، کھلا

ہو جہاں گرمِ غزلخوانی نفس
لوگ جانیں طبلۂ عنبر کھلا

غزل

کنج میں بیٹھا رہوں یوں پر کھلا ؟
کاشکے ! ہوتا قفس کا در کھلا

ہم پکاریں اور کھلے ؛ یوں کون جائے
یار کا دروازہ پاویں گر کھلا ؟

مفت کا ، کس کو برا ہے ، بدرقہ
رہروی میں پردۂ رہبر کھلا

سوزِ دل کا کیا کرے بارانِ اشک ؟
آگ بھڑکی ، مینہ اگر دم بھر کھلا

نامہ کیساتھہ آ گیا پیغامِ مرگ
رہ گیا خط ، میری چھاتی پر ، کھلا

دیکھیو ، غالب سے گر اُلجھا کوئی
ہے ولی پوشیدہ اور کافر ، کھلا

پھر ہوا مدحت طرازی کا خیال
پھر مہ و خُرشید کا دفتر کھلا

خامہ سے پائی طبیعت نے مدد
بادباں بھی، اُٹھتے ہی لنگر، کھلا

مدح سے ممدوح کی دیکھی شکوہ
یاں عرض سے رتبۂ جوہر کھلا

مہر کانپا، چرخ چکر کھا گیا
بادشہ کا رایتِ لشکر کھلا

بادشہ کا نام لیتا ہے خطیب
اب عُلوِ پایۂ منبر کھلا

سکۂ شہ کا، ہوا ہے، روشناس
اب عیارِ آبروی زر کھلا

ملک کے وارث کو دیکھا خلق نے
اب فریبِ طُغرِل و سنجر کھلا

جانتا ہوں ، ہے خطِ لوحِ ازل
تم پہ ، اے خاقانِ نام آور ، کھلا
تم کرو صاحبقرانی ، جب تلک
ہے طلسمِ روز و شب کا در کھلا !!

مثنوی در صفت انبہ

ہاں ، دلِ دردمندِ زمزمہ‌ساز
کیوں نہ کھولے درِ خزینۂ راز؟
خامہ کا صفحہ پر رواں ہونا
شاخِ گل کا ہے گلفشاں ہونا
مجھ سے کیا پوچھتا ہے ، «کیا لکھیے؟»
نکتہ‌ہای خرد فزا لکھیے
بارے ، آموں کا کچھ بیاں ہو جائے
خامہ ، نخلِ رُطب فشاں ہو جائے
آم کا کون مردِ میداں ہے؟
ثمر و شاخ ، گوی و چوگاں ہے

تاک کے جی میں کیوں رہے ارماں؟
آئیے؛ یہ گوی اور یہ میداں!

آم کے آگے پیش جاوے خاک!
پھوڑتا ہے جلے پھپولے، تاک

نہ چلا جب کسی طرح مقدور
بادۂ ناب بن گیا، انگور

یہ بھی ناچار جی کا کھونا ہے
شرم سے پانی پانی ہونا ہے

مجھ سے پوچھو؛ تمھیں خبر کیا ہے؟
آم کے آگے نیشکر کیا ہے!

نہ گل اُس میں، نہ شاخ و برگ، نہ بار
جب خزاں آئے، تب ہو اُس کی بہار

اور دوڑائیے قیاس کہاں؟
جانِ شیریں میں یہ مٹھاس کہاں؟

انتخاب غالب

جان میں ہوتی گر یہ شیرینی
کوہکن ، با وجودِ غمگینی

جان دینے میں اُس کو یکتا جان ،
پر وہ یوں سہل دے نہ سکتا جان

نظر آتا ہے یوں مجھے یہ ثمر
کہ دواخانۂ ازل میں مگر

آتشِ گل پہ قند کا ہے قوام
شیرہ کے تار کا ہے ریشہ نام

یا یہ ہوگا کہ فرطِ رافت سے
باغبانوں نے باغِ جنت سے

انگبیں کے ، بحکمِ ربُّ النّاس
بھر کے بھیجے ہیں ، سربمہر گلاس

یا لگا کر خِضَر نے شاخِ نبات
مدتوں تک دیا ہے آبِ حیات

تب ہوا ہے ثمر فشاں یہ نخل
ہم کہاں، ورنہ، اور کہاں یہ نخل!

تھا ترنجِ زر ایک خسرو پاس
رنگ کا زرد، پر کہاں بوباس؟

آم کو دیکھتا، اگر اک بار
پھینک دیتا طلای دست افشار

رونقِ کارگاہِ برگ و نوا
نازشِ دودمانِ آب و ہوا

رہروِ راہِ خلد کا توشہ
طوبیٰ و سدرہ کا جگر گوشہ

صاحبِ شاخ و برگ و بار ہے، آم
ناز پروردۂ بہار ہے، آم

خاص وہ آم، جو نہ ارزاں ہو
نوبرِ نخلِ باغِ سلطاں ہو

وہ کہ ھے والیء ولایتِ عہد
عدل سے اُس کے ھے حمایتِ عہد

فخرِ دیں ، عزِ شان و جاہِ جلال
زینتِ طینت و جمالِ کمال

کارفرمای دین و دولت و بخت
چہرہ آرای تاج و مسند و تخت

سایہ اُس کا ہُما کا سایہ ھے
خلق پر وہ خدا کا سایہ ھے

اے مفیضِ وجودِ سایہ و نور!
جبتلک ھے نمودِ سایہ و نور

اس خداوندِ بندہ پرور کو
وارثِ گنج و تخت و افسر کو

شاد و داشاد و شادماں رکھیو!
اور غالب پہ مہرباں رکھیو!

قطعات

اے شہنشاہِ فلک منظر، بے مثل و نظیر
اے جہاندارِ کرم شیوہ، بے شبہ و عدیل

پانو سے تیرے ملے فرقِ ارادت، اورنگ
فرق سے تیرے کرے کسبِ سعادت، اِکلیل

تیرا اندازِ سخن، شانۂ زلفِ الہام
تیری رفتارِ قلم، جنبشِ بالِ جبریل

تجھ سے، عالم پہ کھلا رابطۂ قربِ کلیم
تجھ سے، دنیا میں بچھا مایدۂ بذلِ خلیل

بسخن، اوج دہِ مرتبۂ معنی و لفظ
بکرم، داغ نہِ ناصیۂ قلزم و نیل

تا ترے وقت میں ہو عیش و طرب کی توفیر
تا ترے عہد میں ہو رنج و الم کی تقلیل

ماہ نے چھوڑ دیا، ثور سے جانا باہر
زہرہ نے ترک کیا، حوت سے کرنا تحویل

تیری دانش ، مری اصلاحِ مفاسد کی رہین
تیری بخشش ، مرے انجاحِ مقاصد کی کفیل

تیرا اقبالِ ترحم ، مرے جینے کی نوید
تیرا اندازِ تغافل ، مرے مرنے کی دلیل

بختِ ناساز نے چاہا کہ نہ دے مجکو اماں
چرخِ کجباز نے تاکا کہ کرے مجکو ذلیل

پیچھے ڈالی ہے سرِ رشتۂ اوقات میں گانٹھ
پہلے ٹھونکی ہے بنِ ناخنِ تدبیر میں کیل

تپشِ دل ، نہیں بے رابطۂ خوفِ عظیم
کششِ دم ، نہیں بے ضابطۂ جرِّ ثقیل

دُرِ معنی سے مرا صفحہ ، لقا کی داڑھی
غمِ گیتی سے مرا سینہ ، "اَمر" کی زنبیل

فکر میری ، گہر اندوزِ اشاراتِ کثیر
کلک میری ، رقم آموزِ عباراتِ قلیل

میرے ابہام پہ ہوتی ہے تصدق ، توضیح
میرے اجمال سے کرتی ہے تراوش ، تفصیل

نیک ہوتی مری حالت ، تو ندیتا تکلیف
جمع ہوتی مری خاطر ، تو نہ کرتا تعجیل

قبلۂ کون و مکاں ، خستہ نوازی میں یہ دیر !
کعبۂ امن و اماں ، عقدہ کشائی میں یہ ڈھیل !

۲

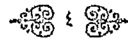
گئے وہ دن ، کہ نادانستہ غیروں کی وفاداری
کیا کرتے تھے تم تقریر ، ہم خاموش رہتے تھے

بس اب بگڑے پہ کیا شرمندگی ؟ جانے دو ، ملجاؤ
قسم لو ہم سے ، گر یہ بھی کہیں : « کیوں ہم نہ کہتے تھے ؟ »

۳

نہ پوچھ اس کی حقیقت ، حضورِ والا نے
مجھے جو بھیجی ہے بیسن کی روغنی روٹی

نہ کھاتے گیہوں ، نکلتے نہ خلد سے باہر
جو کھاتے حضرتِ آدم یہ بیسنی روٹی



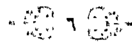
قسمت بری سہی ، پہ طبیعت بری نہیں
ہے شکر کی جگہ ، کہ شکایت نہیں مجھے

صادق ہوں اپنے قول میں، غالب ، خدا گواہ!
کہتا ہوں سچ ! کہ جھوٹ کی عادت نہیں مجھے



افطارِ صوم کی کچھ ، اگر ، دستگاہ ہو
اُس شخص کو ضرور ہے ، روزہ رکھا کرے

جس پاس ، روزہ کھول کے کھانے کو کچھ نہ ہو
روزہ اگر نکھائے ، تو ناچار کیا کرے



گرچہ از روی ننگِ بے ہنری
ہوں خود اپنی نظر میں اتنا خوار

کہ گر اپنے کو میں کہوں خاکی
جانتا ہوں کہ آئے خاک کو عار

شاد ہوں، لیکن، اپنے جی میں، کہ ہوں
بادشہ کا غلامِ کار گزار

خانہ زاد اور مرید اور مداح
تھا ہمیشہ سے یہ عریضہ نگار

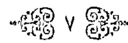
بارے، نوکر بھی ہو گیا، صد شکر!
نسبتیں ہو گئیں مُشَخَّص چار

میری تنخواہ جو مقرر ہے
اُس کے ملنے کا ہے عجب ہنجار

رسم ہے، مردہ کی چھماہی ایک
خلق کا ہے اسی چلن پہ مدار

مجکو دیکھو کہ ہوں بقیدِ حیات
اور چھماہی ہو سال میں دوبار

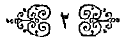
بسکہ لیتا ہوں ہر مہینے قرض
اور رہتی ہے سود کی تکرار
میری تنخواہ میں ، تہائی کا
ہو گیا ہے شریک ، ساہوکار
میری تنخواہ کیجے ماہ بماہ
تا نہو مجکو زندگی دشوار
ختم کرتا ہوں اب دعا پہ کلام
شاعری سے نہیں مجھے سروکار
تم سلامت رہو ہزار برس !
ہر برس کے ہوں دن پچاس ہزار !



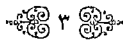
سیہ گلیم ہوں ؛ لازم ہے میرا نام نہ لے
جہاں میں جو کوئی فتح و ظفر کا طالب ہے
ہوا نہ غلبہ میسر کبھی کسی پہ ، مجھے
کہ جو شریک ہو میرا ، شریکِ غالب ہے

رُباعیّات

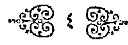
شب زلف و رخِ عرق فشاں کا غم تھا
کیا شرح کروں ؟ کہ طرفہ تر عالم تھا
رویا میں ہزار آنکھ سے صبح تلک
ہر قطرۂ اشک ، دیدۂ پرنم تھا



ہے خلقِ حسد قُماش لڑنے کیلیے
وحشت کدۂ تلاش لڑنے کیلیے
یعنی : ہر بار صورتِ کاغذِ باد
ملتے ہیں یہ بدمعاش لڑنے کیلیے

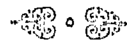


بھیجی ہے جو مجکو شاہِ جمجاہ نے دال
ہے لطف و عنایتِ شہنشاہ پہ دال
یہ شاہ پسند دال ، بے بحث و جدال
ہے دولت و دین و دانش و داد کی دال



کہتے ھیں کہ « اب وہ مردم آزار نہیں
عشاق کی پرسش سے اُسے عار نہیں »

جو ھاتھ کہ ظلم سے اُٹھایا ھوگا ،
کیوں کر مانوں کہ اُس میں تلوار نہیں ؟



ھم گرچہ بنے سلام کرنیوالے
کرتے ھیں درنگ ، کام کرنیوالے

کہتے ھیں : « کہیں خدا سے » ، اللہ ، اللہ !
وہ آپ ھیں صبح و شام کرنیوالے



تمام شد

شرحِ غالب

بسم الله الرحمن الرحیم

غزلیات

(اس حصے میں اشعار کے حوالے کے لیے جو ھندسے استعمال کیے گئے ھیں ، اون میں پہلے سے صفحہ اور دوسرے سے شعر مراد ھے)

[٥ : ٤] اشاره بمقامی که دوست ، بعد از خرابیء بصره ، مستفسر احوال شده باشد (پنج آھنگ : ٤١) . « احوال » کے متعلق قدر بلگرامی کو لکھتے ھیں : « حال » کی جگه « حالات » یا « احوال » لکھنا قبیح نہیں ھے ، خصوصاً « احوال » که یه بمعنیء واحد مستعمل ھے اور یه استعمال یہانتک پہنچا ھے که « احوال » بمعنیء جمع مستعمل نہیں ھوتا ؛ جیسے ، « حور » که بمعنی « حوراء » کے ، اھل فارس اس کو صیغۂ واحد قرار دیکر ، الف نون کیساتھه اس کی جمع لاتے ھیں . . . . میں نے ایك مقطع میں ، « حال » کی جگه « احوال » لکھا ھے : جان غالب ! تاب گفتاری گمان داری هنوز ، آه (خطوط : ١ ، ١٨١) .

[٧ : ٢] لایق معاملۂ بیع و شرا ، در صورتی که کاتب بایع و مشتری مکتوب الیه باشد (پنج آھنگ : ٤٤) .

[٨ : ٢] اظهار نسبت ارادت بروش استفهام (ایضاً : ٤١) .

[٨ : ٥] طلب تفقد بذریعۂ بخشایش بر طمع خام (ایضاً) . آزرده کے نام کے خط میں قدرے تغیر کیساتھه ، یه شعر نقل کیا ھے . فرماتے ھیں : قبلۂ حاجات ! اگر این بندۂ اندك شنو ، بسیار گوی ، زود گستاخ ، دیر پشیمان را حق بندگی نیست ، از کجا که برین بی‌بضاعتی نتوان بخشود؟ گیرم وفا ندارد اثر ، آه (ایضاً : ١٢٣) .

[٩ : ١] نازش بر نسبت تعارف ، اگرچه دوست غمخوار نباشد (ایضاً : ٤١) .

[١٢ : ٥] طاعت میں ، تا ، رھے نه مے و انگبیں کی لاگ
دوزخ میں ڈال دو ، کوئی لیکر بہشت کو (انتخاب : ٢٣٦) .

[١٧ : ٤] بیان ناسودمندیء کوشش در بارۂ حصول مطلب (پنج آھنگ : ٤٥ و نیز ٢٤٠) .

[٢١ : ٥] ذریعۂ این اندوه ، که اگر ملامت بجاست ، قطع نظر از تحسین هنر چراست (ایضاً : ٤١) .
[٤٥) .

[٢٣ : ٤] عذر گستاخی خواستن و قاعده ناشناسیء خود را شفیع جرات ساختن (ایضاً :

[٢٤ : ١] بیان کلفت ناسازیء بخت و اندوه پیش نیامدن دولت (ایضاً : ٤٢) .

[۲٦ : ۱] «گل رعنا» کے دیباچے میں فرماتے ہیں : «بر گوشۂ سماط لفظ ، ریزہ چین و کاسہ لیس گزشتہ جادو بیانان ، و بر طرف بساط معنی ، خواجہ تاش و ہم پیالۂ آنانم . چہ اگر دیگران را ، از خزینۂ جود مبداء فیاض ، لعل و گوہر بدامن فطرت میدهند ، مرا نیز خرمہرۂ چند در جیب وکنار اندیشه می نہند . نگویم ، تازہ دارم ، آہ» (پنج آہنگ : ۵۷) .

[۲۷ : ٤] جور سے باز آئے ، پر باز آئیں کیا ؟

کہتے ہیں : «ہم تجھ کو منہ دکھلائیں کیا؟» (انتخاب : ۲۰۵)

کبھی ، نیکی بھی اسکے جی میں ، گر آجائے ہے مجھسے

جفائیں کرکے اپنی یاد ، شرما جائے ہے مجھسے (ایضاً : ۲۷۷) .

[۳۳ : ۵] شرح شدت بی برگ و نوائی بروش خاص (پنج آہنگ : ٤۵) .

[۳٤ : ۲] مرزا تفتہ کو لکھتے ہیں : «سبحان اللہ ! تم جانتے ہو کہ میں اب دو مصرعے موزوں کرنے پر قادر ہوں ، جو مجھ سے مطالع مانگتے ہو . گمان زیست بود برمنت زبیدردی ، آہ» (خطوط : ۱ ، ۹۱) . انہیں کو دوسرے خط میں تحریر کیا ہے : «میرا عجب حال ہے . حیران ہوں کہ تمہیں میرا کلام کیوں باور نہیں آتا ؟ گمان زیست بود ، آہ . سامعہ مر گیا تھا ، اب باصرہ بھی ضعیف ہو گیا . جتنی قوتیں انسان میں ہوتی ہیں ، سب مضمحل ہیں . حواس سراسر مختل ہیں . حافظہ گویا کبھی نہ تھا . شعر کے فن سے گویا کبھی مناسبت نہ تھی» (ایضاً : ۹٦) . علائی کے خطوں میں بھی یہ شعر استعمال کیا ہے (اردو : ٤۱٦ و ٤۲۹) .

[۳٤ : ۳] اس غزل کے عنوان پر ، میرزا صاحب نے اپنے قلم سے لکھا ہے : «عاشق ہونا معشوق کا» (انتخاب فارسی ، مخطوط ، ق : ۸ ب) .

[۳٦ : ۲] ترحم دوست را نسبت بخویش ازساختگی گمان کردن (پنج آہنگ : ٤۲) .

[۳۹ : ۲] یہ شعر میرزا صاحب نے آخر عمر میں اکثر خطوں کے اندر درج کیا ہے . سرور کو لکھتے ہیں : «کاش ! وہ میری رنجوری کا حال کہتے ، ضعف قوی واضمحلال کہتے ؛ تاکہ میں ان کے کلام کی تصدیق کرتا ، ان کی غمخواری اور دردمند نوازی کا دم بھرتا . ہے ، ہے ! درکشاکش ضعفم نگسلد ، آہ» (اردو : ۱٤۷ وعود : ٤۱) . نواب انور الدولہ بہادر ، شفق ، کو تحریر فرماتے ہیں : «آپ کی پرسش کے کیوں نہ قربان جاؤں ؟ کہ جبتک میرا مرنا نہ سنا ، میری خبر نہ لی . میری مرگ کے مخبر کی تقریر اور ، مثلہ ، میری یہ تحریر ، آدھی سچ اور آدھی جھوٹ . در صورت مرگ ، نیم مردہ اور در حالت حیات ، نیم زندہ ہوں . درکشاکش ضعفم ، آہ» (ایضاً : ۲۹٦ و ایضاً : ۱۱۹) . قدر بلگرامی کو لکھا ہے : «میں اب اچھا ہوں . برس دن صاحب فراش رہا ہوں . چھوٹے بڑے زخم بارہ اور ہر زخم خوں چکاں . ایك درجن پھاہے لگ جاتے تھے . جسم میں جتنا لہو تھا ، پیپ ہوکر نکل گیا . تھوڑا سا جو جگر میں باقی ہے ، وہ کھا کر جیتا ہوں . کبھی کھاتا ہوں ، کبھی پیتا ہوں . مرض کے آثارمیں سے اب بھی یہ نشان موجود ہےکہ دونوں پانوؤں کی دو دو انگلیاں

ٹیڑھی ہو گئی ہیں، معہذا متورم ہیں۔ جوتا نہیں پہنا جاتا۔ ضعف کا تو بیان ہو ہی نہیں سکتا، مگر ہاں یہ میرا شعر: درکشاکش ضعفم، آہ (خطوط: ۱، ۱۹۵).

[۴۰: ۳] خاطر دوست را، بذورباش دوستانہ، آزردن و بہ گستاخی و بیدردی کار از پیش بردن (پنج آہنگ: ۴۲).

[۴۱: ۳] سزاوار مقامی کہ دوست پاسخ نامہ نگاشتہ باشد وجواب اصل مدعا فروگزاشتہ باشد (ایضاً: ۴۳).

[۴۱: ۵] پردہ‌کشائی راز افلاس بانداز عاشقانہ (ایضاً: ۴۵).

[۴۳: ۵] دوست را، نظر بہ بی التفاتی، بہ بیسد تشبیہ دادن و ازان نیز ترقی کردن (ایضاً: ۴۳).

[۵۰: ۳] «داشتن» بمعنی رکھنی کی ہی، لیکن اہل زبان بمعنیء «بایستن» بھی استعمال کرتی ہیں، ظہوری: گر اسیر زلف و کاکل گفتہ باشم خویش را

گفتہ باشم؛ این قدر بر خویش پیچیدن نداشت

میری شعر میں پہلی مصرع کا «داشت» بمعنی رکھنی کی اور دوسری مصرع کا «داشت» بمعنیء «بایست» ہی.

مفہوم شعر یہ کہ دوست ایسا حیلہ ڈھونڈھتا تھا کہ اس کی ذریعی سی مجھہ پر خفا ہو. چاہتا تھا کہ آزردہ ہو، مگر سبب نہیں پاتا تھا. قضا را، کچھہ دنوں کی بعد، رقیب سی معشوق کو ملال ہوا. میری جو شامت آئی، میں نی دوست سی پوچھا کہ «رقیب نی کیا گناہ کیا، جو راندۂ درگاہ ہوا؟» معشوق اسی گستاخی کو بہانۂ عتاب ٹھہرا کر، آزردہ ہوگیا. اب شاعر افسوس کرتا ہی اور کہتا ہی: «ہای! پرسیدن نداشت». یعنی: پوچھنا نہ چاہی تھا (اردو ۳۸۹، لاہوری ایڈیشن).

[۵۱: ۱] بیان تنعم دوست و بی برگیء خود و طلب تفقد (پنج آہنگ: ۴۳).

[۵۵: ۱] کلیات فارسی کی دیباچی میں یہ شعر لکھکر فرماتی ہیں: لای خم میخانۂ سرمدی نسبت ناچشیدگان سگالند کہ ہیچمدانی را این مایہ سیرابیء نطق از کجاست؟ غافل کہ نم رشحۂ یک فیض است کہ سبزہ را دمیدن، و نہال را سرکشیدن، و میوہ را رسیدن، و لب را زمزمہ آفریدن آموخت» (نولکشور ایڈیشن، طبع اول: ۴).

[۵۷: ۲] بایستہ بمقامی کہ دوست اندوہ دوست را اندک ساختہ باشد (پنج آہنگ: ۴۳).

[۵۷: ۵] بیان بقیۂ کلفت و اندوہ و ملال بعد سپری شدن روزگاری دراز در غم و درد (ایضاً: ۴۵).

[۵۸: ۵] پیش آمدن کار مشکل بجای خطرناک (ایضاً: ۴۲).

[۶۱: ۵] بیان این معنی کہ اندک آسایش و فراغ خاطر و صفای وقت اگر میسر آید، تن بزحمت جستجو نباید داد، و بہ بند گرد آوردن مال نباید افتاد (ایضاً: ۴۳).

[٦٤ : ٣] تعلیم تسلیم (پنج آهنگ : ٤٣).
[٦٦ : ٤] در آزردگیء دوست خود را بعلاقهٔ تعلق تسلی دادن (ایضاً : ٤٦).
[٦٧ : ٥] شایسته بمقامی که این کس، بسبب طول زمان انتظار، از معاودت قاصد مایوس شده باشد (ایضاً).
[٦٩ : ٣] سزاوار بحال کسی که از تنعم و تمول برآمده، در تلاش معاش افتاده باشد (ایضاً).
[٧٠ : ٦] «نامهٔ غالب» میں لکھتے ھیں: «اگر مجھه سے کوئی کہے کہ «غالب، تیرا بھی مولد هندوستان ھے»، میری طرف سے جواب یہ ھے کہ «بنده هندی مولد و پارسی زبان ھے. هرچه از دستگهٔ پارس به یغما بردند، آه. زباندانیء فارسی میری ازلیء دستگاه اور یه عطیه خاص من جانب الله ھے» (عود : ١٤٤).
[٧١ : ٣] اس شعر کے متعلق شاکر کو لکھتے ھیں: «فقیر همیشه مورد اعتراضات رها ھے. لیکن اکثر ایسا هوا ھے کہ بعد دو چار دن کے، معترض صاحب کا خط آیا ھے، لغت و ترکیب معترض فیه کی سند کے اشعار حضرت نے اس خط میں درج کیے ھیں. الله الله! جو کلکتے میں شور نشور اٹھا تھا. میرا شعر: جزوی از عالم و از همه عالم بیشم، آه، خستهٔ جراحتهای اعتراض هوا ھے. منشای اعتراض یه کہ عالم مفرد ھے، اس کا ربط همه کے ساتھه بحسب اجتهاد قتیل ممنوع ھے. قضا را، اس زمانے میں شاهزادهٔ کامران درانی کا سفیر گورمنٹ میں آیا تھا. کفایت خان اس کا نام تھا. اس تك یه قصه پهنچا. اس نے اساتذه کے اشعار پان سات ایسے پڑھے، جن میں «همه عالم و همه روز و همه جا» مرقوم تھا، اور وه اشعار «قاطع برهان» میں مندرج ھیں» (عود : ١٧٨ و ١٧٩).
[٧٢ : ٦] تسکین خاطر دوست، باظهار قرب زمان هلاك خویش (پنج آهنگ : ٤٣).
[٧٤ : ٤] آغاز جواب مکتوب، بشکر یادآوریء محبوب (ایضاً).
[٧٥ : ٤] اختصار درد دل به وا نمودن یك مثال (ایضاً : ٤٤).
[٧٨ : ٣] تباهیء خود را مقصود دوست دانستن و بدان شادمان بودن (ایضاً).
[٧٩ : ٢] از پاس ادب ستوه آمدن ورخصت شکوه طلبیدن (ایضاً : ٤٣).
[٨٠ : ٤] شعری که آغاز بیان شکایت بدان توان کرد (ایضاً : ٤٦).
[٨٢ : ٣] اظهار آماده بودن خویش بدعای بد، یا تظلم و استغاثه (ایضاً).
[٨٢ : ٥] انکار ظهور اعانت و اقرار حصول مدعا محض بسابقهٔ عنایت ازلی (ایضاً).
[٨٤ : ٥] در مقام این مثل که گوئی: «هنوز روز اول است» (ایضاً : ٤٥).
[٨٦ : ١] بیان شدت غم (ایضاً : ٤٤).
[٩٠ : ٦] طلب تفقد باظهار عزم آوارگیء خویش (ایضاً : ٤٣).
[٩٢ : ٤] منشی غلام غوث خان بهادر بیخبر کو لکھا ھے: «قبله! میرا ایك شعر ھے: خود پیش خود کفیل گرفتاریء منست، آه. یه معامله میرا اور آپ کا ھے. خارج سے مسموع

هوا هی کہ میں نے جو اغلاط «برهان قاطع» کے نکال کر، ایك نسخۂ موسوم بہ «قاطع برهان» لکھا هی اور ایك مجلد اوس کا آپ کو بھی بھیجدیا هی، آپ اوس کی تردید میں کوئی رسالہ لکھہ رهی هیں . اگرچہ باور نہیں آیا ، لیکن عجب آیا » (اردو: ۲۸۵، نیز پنج آهنگ : ۲۳۶)۔

[۹٦ : ٤] «انگبین» شہد کو کہتے هیں ، اور «تبرزد» مصری کو کہتے هیں . ان معنوں میں کہ یہ مانند قند اور بتاسوں کے جلد ٹوٹنے والی نہیں . جب تك اس کو تبر سے نہ توڑو، مدعا حاصل نہیں هوتا . «بدر زدن» اگرچہ لغوی معنی اس کے هیں باهر مارنا ، یعنی : بدر، باهر اور زدن ، مارنا ؛ لیکن روزمرہ میں اس کا ترجمہ هی : نکل جانا . اب جب یہ معلوم هوگیا ، تو یوں سمجھیے کہ معشوق کے هونٹوں کو میٹھا کہتے هیں اور قند اور مصری اور شہد سے نسبت دیتے هیں . اور البتہ مکھی مٹھاس کی عاشق هی. پس جو مکھی کہ مصری پر بیٹھی، وہ جب چاهی بے تکلف اوڑ جائے. اور جو مکھی کہ شہـد پر بیٹھےگی ، جب اوڑنے کا قصد کریگی ، پروبال اوس کے شہد میں لپٹ جائینگی اور وہ مر کر رهجائےگی .

پس اب یہ کہتـا هی کہ میری معشوق کے هونٹ شـیرینی میں میری واسطے شہد هوگئے اور رقیب کے واسطے مصری ، یعنی : وہ چاٹ کر ، لطف اوٹھا کر، صحیح و سالم چلا گیا ، اور میں پھنس کر، وهیں مر کر، رہ گیا (اردو: ۳۹۰ ، لاهوری ایڈیشن) .

[۹٦ : ٥] یہ خیال هی . یعنی : ایك گھر میں اوس کا محبوب بیٹھا هوا هی. اور اوس نے جان لیا هی کہ کون هی؛ مگر بطریق تجاهل بھولا بنکر پوچھتا هی کہ «آیا ، اس گھر میں ایسا کون هی کہ مہر، یعنی : آفتاب ، نے اپنی سـانس کے ٹکڑے، فرط شوق سے ، دروازے کے روزن پر پھینك دیے هیں ؟» آفتاب کے خطوط شعاعی کا روزنوں میں پڑنا اور ان خطوط شعاعی کا ، یعنی : سورج کی کرن کا ، بصورت سانس کے ٹکڑوں کے هونا ظاهر هی (ایضاً : ۳۹۱) .

[۹٦ : ٦] «خندۂ دندان نمـا» اوس هنسی کو کہتے هیں ، جو تبسم سے بڑھکر هو، اور اوس میں دانت هنسنے والے کے دکھـائی دیں . معشوق موتیوں کے حسن پر هنسا ، اور هنسنـا کوئی اوس چیز پر هی ، جس کو اپنے نزدیك ذلیل سمجھہ لیتا هی . حاصل معنی یہ : کہ میرا معشوق موتیوں کے حسن پر هنسا . گویا ، اوس نے یہ دعوی کیا کہ موتی اچھی چیز نہیں .

اب دعوی کے واسطے دلیل ضرور هی . شاعر کہتا هی کہ میری معشوق کے دعوی پر دلیل بدیہی هی. یعنی : هنسنے میں اوس کے دانت نظر آئے؛ معلوم هوا کہ وہ حسـن ، جو لوگ موتی میں گمان کرتے تھے، وہ لغو هی : حسن یہ هی کہ جو معشوق کے دانتوں میں هی (ایضاً) .

[۹٦ : ۷] یہ گستاخانہ اپنے پروردگار سے کہتا هی کہ جب اس عالم میں تونے میری داد نہ دی، اور میری خواهشیں پوری نہ کیں ، تو بس اب معـلوم هوا کہ میں لایق التفـات کے نہ تھا . پس جب میں لایق توجہ کے نہیں ، تو اب عالم عقبی میں میری گناهوں کا مواخذہ کیا ضرور هی؟ جب هماری مطالب آپ نے هم کو نہ دیے، تو هماری معاصی کا بھی شمار نہ کیجے . جانے

دیجی۔ هم میں التفات کی ارزش نہیں (ایضاً : ۲۹۲) .

[۹۸ : ٦] باعث ترك صحبت را بجملا خاطر نشان ساختن و تفصیل آن را به بیان همدمان حواله کردن (پنج آهنگ : ٤٤) .

[۹۹ : ٦] اظهار وفای خویش نسبت بحاکم یا بدوست (ایضاً : ٤٣) .

[۱۰٦ : ۱] طلب تفقد بطریق تنزل (ایضاً : ٤٤) .

[۱۰٦ : ٥] بیان انتظار قاصد در امر مذبذب (ایضاً : ٤١) .

[۱۱۲ : ٦] اظهار حسن عقیدت بمقابلهٔ بی پروائیء دوست (ایضاً : ٤٤) .

[۱۱۳ : ۱] وصف لکنت زبان (ایضاً : ٤٢) .

[۱۱۳ : ٥] خواهش حیات خود از جانب دوست از محبت نشمردن ، و آن را بر شدت بیدردی گمان بردن (ایضاً : ٤٢) .

[۱۱٦ : ٦] گزارش این معنی که وعدهٔ لطف در مستقبل چارهٔ ناکامیء حال نمی تواند بود (ایضاً : ٤٣) .

[۱۲٦ : ۱] اس غزل کی باری میں شیخ امام بخش ناسخ لکھنوی کو لکھا هی: « غزلی که اندرین روزها بتازگی در روش تازه گفته ام ، بعد عذرخواهیء تقصیرکوته قلمی ، بر حاشیهٔ مکتوب می‌نگارم ، و چشم آن دارم که داغ محرومیء قبول نه بیند ، و از دیده بدل جا گزیند » (ایضاً : ۱۱۳) .

[۱۳۸ : ۱] خواهش وصل و تقاضای عیش (ایضاً : ٤١) .

[۱٤٥ : ۳] استدعای عنایت به نهیب قطع محبت (ایضاً : ٤٤) .

[۱٤۹ : ٥] « مان » ، مع النون ، بمعنیء « ما را » مستعمل اهل زبانست (حاشیهٔ آ : ق ، ۳٤ ب) . و در ب : « یعنی ما را » (ق ، ۱۱۱ ، الف) . و بهردو جا بخط خود غالب است .

[۱٥۰ : ۱] « مان » ، صیغهٔ امر از ماندن (ایضاً). و در ب : « یعنی بگزار» (ق ، ۱۱۱ ب). و بهردو جا بخط خود غالب .

[۱٥۳ : ٥] گزارش شدت رنج و غم بطریق ترقی (پنج آهنگ : ٤٢). اس غزل کی باری میں امین الدوله کو لکھتی هیں : « حالیا غزلی هم ازان اوراق نگاشته می شود ، تا از سوز درون نامه نگار خبر تواند داد » (ایضاً : ۱۸۲) .

[۱٥٦: ٥] در موقع تعلیم صبر و شکیبائی (ایضاً : ٤٢ و۱۲۲) .

[۱٦۰: ۲] حوالهٔ مادهٔ شکایت بوجدان ضمیر مکتوب الیه (ایضاً : ٤٢) .

[۱٦٦: ۷] « لیلی نکوه »، بدگویندهٔ لیلی (حاشیهٔ آ : ق ، ۳۸ ب ، بخط غالب).

[۱٦۷: ۲] درخور بیان گلهٔ بدعهدی وگرانی بیشگیء دوست (پنج آهنگ : ٤١) .

رباعیات

[۱۷۷: ۳ و ٤] مولوی سراج الدین احمـــد کی نام کی خط میں فرماتی هیں: « در سخن از پرورش یافتگان مبداء فیاضم، و سواد معنی را بفروغ گوهر خویش روشن کرده ام . از هیچ آفریده ، حق آموزگاریم بگردن ، و بار منت رهنمائیم بر دوش ، نیست . غالب بگهر زدودهٔ زادشمم ، آه » (ایضاً : ۱۵۵).

[۱۷۹: ۵ و ٦] اس رباعی کی متعلق حکیم مومن خان مرحوم کو لکھا هی: « فروغ طالع گفتار، سلامت ! دوش ، اندیشهٔ دیوانگی پیشـــه ، با روشنان سپهر مرزنشی که به پرخاش انجامـــد ، آغازکرد ، و تیغ دودمهٔ چارمین مصرع این رباعی درمیانهٔ آن هفت فروزنده پیکر بنهاد . آنم که به پیمانهٔ من ساقیء دهر، آه » (ایضاً : ۱۲۵) .

[۱۸۱: ۳ و ٤] ذکا کو ایك مکتوب ، مورخهٔ ٤ دسمبر سنه ۱۸٦٦ع ، میں لکھا هی: « هر شخص نی بقدر حال ایك ایك قدردان پایا . غالب سوخته اختر کو هنر کی داد بهی نه ملی .

کسم بخود نه پزیرفت و دهر بازم برد چو نامهٔ که بود نا نوشـــته عنوانش

یه شعر میرا هی، ولیعـــهد خسروی دهلی ، میرزا فتح الملك بهادر مغفور کی قصیدی کا . اور دیکهو ایك رباعی میری : دستم بکاید مخزنی می‌بایست ، آه » (اردو:٤٢) .

[۱۸۲: ۳ و ٤] دیباچهٔ سراج المعرفت ، مصنفهٔ مفتی سید رحمت علیخان بهادر، عرف مفتی میر لال ، میں میرزا صاحب نی لکها هی: « سچ بهی تو هی ، آدمی کیونکر سمجهه سکی، اور بطلان بدیهیات کی جواز پر اوس کو کیونکر تســـلی هو؟ یعنی اس مجموع موجودات کو، که افلاك و انجم و بحار و جبال اسی میں هیں ، نیست‌ونابود محض جان لی اور تمام عالم کو ایك وجود مان لی . ای کرده بآرایش گفتـــار بســـیچ ، آه » (اردو: ۲٤۷ ، لاهوری ایڈیشن ، نیز پنج آهنگ: ۲۲٦ وکلیات نثر فارسی: ۲۵۹) .

[۱۸۲: ۵ و ٦] اس رباعی کی متعلق مرورکو لکھا هو: « میں پان سات برس سی بہرا هو گیا هوں . ایك رباعی چار قافیی کی اس مضمون خاص کی میں نی لکھی هو ، برعایت صنعت ذوقافیتین . دارم دل شاد و دیدهٔ بینائی ، آه » (عود : ۱۱) .



غزلیات

[۱۹۰ : ۵] نہ پوچھہ بیخودیء عیش مقدم سیلاب — کہ ناچتی ھیں پڑی سربسر، در و دیوار

[۱۹۲ : ۳] میرزا صاحب کی مکتوب بنام سرور کی اس حصی سی شعر کی مضمون پر روشنی پڑتی ھی : « بندہ پرورا میرا کلام، کیا نظم، کیا نثر، کیا اردو، کیا فارسی، کبھی کسی عہد میں میری پاس فراھم نہیں ھوا. دوچار دوستوں کو اس کا التزام تھا، کہ وہ مسودات مجھہ سی لیکر جمع کرلیا کرتی تھی. سو اون کی لاکھوں روپی کی گھر لٹ گئی، جس میں ھزاروں روپی کی کتابخانی بھی گئی. اوس میں وہ «مجموعھای پریشاں» بھی غارت ھوی» (عود : ۲۷).

[۱۹۲ : ٥] ملاحظہ ھو، ۱۹٤ : ۳ .

[۱۹۷ : ۲] یہی مضمون اس شعر میں نظم کیا ھی:

رنج نومیدیء جاوید گوارا رھیوا — خوش ھوں، گرنالہ زبونیکش تاثیر نہیں

اس غزل کی متعلق مہر کو لکھا ھی : « میرا کلام میری پاس کبھی کچھہ نہیں رھا. نواب ضیاء الدین خان اور نواب حسین مرزا جمع کر لیتی تھی. جو میں نی کہا، اونھوں نی لکھہ لیا. ان دونوں کی گھر لٹ گئی. ھزاروں روپی کی کتابخانی برباد ھوی. اب میں اپنی کلام کی دیکھنی کو ترستا ھوں.

کئی دن ھوی کہ ایك فقیر، کہ وہ خوش‌آواز بھی ھی اور زمزمہ پرداز بھی ھی، ایك غزل میری کہیں سی لکھوا لایا. اوس نی وہ کاغذ جو مجکو دکھایا، یقین سمجھنا کہ مجکو رونا آیا» (اردو : ۲۵۹ و عود : ۱۰۸) .

[۱۹۹ : ۱] ملاحظہ ھو، ۲۳٦ : ۳ ، ۲۳۷ : ۷ ، ۲۹۱ : ۷ .

[۱۹۹ : ٦] یہی مضمون اس شعر میں بھی نظم ھوا ھی:

ھی کس قدر ھلاك فریب وفای گل! — بلبل کی کاروبار پہ ھیں خندھای گل

[۲۰۰ : ۱] اسی مضمون کو قدری تغیر کیساتھہ باندھتی ھیں :

پڑا رہ، ای دل وابستہ! بیتابی سی کیا حاصل؟ — مگر، پھر، تاب زلف پرشکن کی آزمایش ھی؟

[۲۰۰ : ٥] ملاحظہ ھو، ۲۲۸ : ٥ .

[۲۰۲ : ٥] ملاحظہ ھو، ۲۳٥ : ٥ .

[۲۰٤ : ۷] فارسی میں بھی تقریباً یہی مضمون لکھا ھی:

غالب، نخورد چرخ فریب، ار ھزار بار — گفتم: « بروزگار سخنور چومن بسیست »

[۲۰٥ : ۳] ملاحظہ ھو، ۲٦۳ : ۳ .

[۲۰٥ : ٤] اس غزل کی پانچ شعر «مہر» کو لکھکر، مطلع کی باری میں فرمایا ھی: «دیکھنا،

بهائی! اس غزل کا مطلع کیا هی:
جور سی باز آئیں، پر باز آئیں کیا؟ کہتی هیں: «هم تجکو منه دکھلائیں کیا؟»
(اردو: ۲٦٦ و عود: ۱۱۲، مگر پہلی مصرع کی الفاظ آ و ب سی کسیقدر مختلف هیں).

[۲۰٦ : ۲] «سرور» کو ایك خط میں لکھتی هیں: «میں تو اب روز و شب اس فکر میں هوں که زندگی تو یوں گزری، اب دیکھی، موت کیسی هو؟ عمر بهر دیکھا کیا مرنی کی راه، آه. میرا هی شعر هی اور میری هی حسب حال هی» (اردو: ۱۳۹ و عود: ۳۲).

[۲۰۸ : ۱] ملاحظه هو، ۲۱٦ : ٤.

[۲۱۲ : ۷] ملاحظه هو، ۲۱٦ : ٦.

[۲۱٦ : ۱] «میرزا تفته» کو لکہا هی: «کیوں ترك لباس کرتی هو؟ پہننی کو تمہاری پاس هی کیا، جس کو اوتار کر پهینکوگی؟ ترك لباس سی قید هستی مٹ نه جائیگی. بغیر کھانی پیی گزارا نهوگا. سختی و سستی، رنج و آرام کو هموار کردو. جس طرح هو، اوسی صورت سی بهرصورت گزرنی دو: تاب لائی هی بنیگی غالب، آه» (اردو: ۱۰۸).

«علائی» کو تحریر کیا هی: «بهائیوں سی پهر نہیں ملا. بازار میں نکلتی هوئی ڈر لگتا هی. جواهر خبردار، میرا سلام اخوین کو اور اون کا سلام مجکو پهنچا دیتا هی. اس کو غنیمت جانتا هوں: تاب لائی هی بنیگی غالب، آه» (ایضاً: ۳۹۳).

[۲۱٦ : ٤] ملاحظه هو، ۲۰۸ : ۱.

[۲۱٦ : ٦] ملاحظه هو، ۲۱۲ : ۷.

[۲۲٤ : ۱] ملاحظه هو، ۲٤٤ : ٤.

[۲۲٤ : ۲] ملاحظه هو، ۲٦۹ : ٥.

[۲۲٥ : ۱] میرزا صاحب نی ایك خط میں «تفته» کو لکھا هی: «یعنی: «اب جو دور مجهه تك آیا هی، تو میں ڈرتا هوں»، یه سارا جمله مقدر هی. میرا فارسی کا دیوان جو دیکھیگا، وه جانیگا که جملی کی جملی مقدر چهوڑ جاتا هوں. مگر «هر سخن وقتی و هر نکته مکانی دارد». یه فرق البته وجدانی هو، بیانی نہیں» (اردو: ۲٦۹، لاهوری ایڈیشن، ۱۹۳۷ ع و خطوط: ۱، ۲٥).

[۲۲۷ : ۳] ملاحظه هو، ۲٦۹ : ٤.

[۲۲۷ : ٤] یه شعر، قدری تغیر کیساتهه، شاه عالم صاحب مارهروی کی خط میں لکھا هی. فرماتی هیں: «حضرت صاحب عالم کی تمنای دیدار بقید مارهره کنایه اس سی هی که اور کسی کا یہی دیدار مطلوب هی. خواهش وصل مقدر هی، جو مذکور نہیں» (اردو: ۲۰۰).

[۲۲۸ : ٥] ملاحظه هو، ۲۰۰ : ٥.

[۲۳۱ : ۱] اس غزل کی متعلق منشی شیونراین کو اپریل سنه ۱۸٥۹ع میں لکہا هی: «ایك دوست کی پاس اردو کا دیوان چهاپی سی کچهه زیاده هی. اوس نی کہیں کہیں سی مسودات

متفرق بہم پہنچا لی ہیں . چنانچہ «پنہاں ہوگئیں ، ویراں ہوگئیں» یہ غزل مجکو اوسی سی ہات آگئی ہی » (اردو: ۳٦٨) .

[۲۳۲ : ٤] «یعنی : اگر تیرا ملنا آسان نہیں ، تو یہ امر مجھہ پر آسان ہی. خیر ، تیرا ملنا آسان نہیں ، نہ سہی . نہ ہم مل سکیں گی ، نہ کوئی اور مل سکیگا . مشکل تو یہ ہی کہ وہی تیرا ملنا دشوار بھی نہیں . یعنی : جس سی تو چاہتا ہی ، مل بھی سکتا ہی . ہجر کو تو ہم نی سہل سمجھہ لیا تھا ، مگر رشك کو اپنی اوپر آسان نہیں کرسکتی » (عکس خط غالب ، دیوان اردو ، بدایوں ایڈیشن ، ۱۹۲۳ع) .

[۲۳٤ : ۱] ملاحظه هو ، ۲٤۳ : ٤ .

[۲۳٤ : ٦] اس غزل کی متعلق قاضی عبـــد الجمیل بریلوی کو لکھتی ہیں : «دل ہی تو ہو ، آہ ، ایك دوست کی پاس بقیة النہیب والغـارة کچھہ میرا کلام موجود ہی . اوس سی یہ غزل لکھوا کر بھیجدوں گا » (اردو: ۲۱۲). اس شعر کی شرح میں فرماتی ہیں : «مولویصاحب ، کیا لطیف معنی ہیں ! داد دینـا . حسن عارض اور حسن ظن ، دو صفتیں محبوب میں جمع ہیں . یعنی : صورت اچھی ہی اور گمان اوس کا صحیح ہی ، کبھی خطـا نہیں کرتا . اور یہ گمان اوس کو بہ نسبت اپنی ہی ، کہ میرا مارا کبھی بچتا نہیں اور میرا تیر غمزہ خطا نہیں کرتا . پس جب اوس کو اپنی پر ایسا بھروسا ہی ، تو رقیب کا امتحان کیوں کری؟ اس حسن ظن نی رقیب کی شرم رکھہ لی ؛ ورنہ یہاں معشوق نی مغالطه کھایا تھـا . رقیب عاشق صادق نہ تھا ، ہوســناك آدمی تھا . اگر پای امتحان درمیان آتا ، تو حقیقت کھل جاتی » (عکس خط غالب ، دیوان اردو ، بدایوں ایڈیشن ، ۱۹۲۳ ع) .

[۲۳٥ : ٥] ملاحظه هو ، ۲۰۲ : ٥ .

[۲۳٦ : ۱] اس مضمون کو حسب ذیل بیت میں بھی باندھا ہی :

کیا زہد کو مانوں ؟ کہ نہو گرچہ ریائی ، پاداش عمـــل کی طمع خام بہت ہی

[۲۳٦ : ۳] ملاحظه هو ، ۱۹۹ : ۱ ، ۲۳۷ : ۷ ، ۲۹۱ : ۷ .

[۲۳٦ : ٤] ملاحظه هو ، ۲٤۷ : ٤ .

[۲۳۷ : ۷] ملاحظه هو ، ۱۹۹ : ۱ ، ۲۳٦ : ۳ ، ۲۹۱ : ۷ .

[۲۳۹ : ٤] علائی کو تحریر کیا ہی : «تمہاری دیکھنی کو دل بہت چاہتا ہی ، اور دیکھنا تمہارا موقوف اس پر ہی کہ تم یہاں آؤ . کاش ! اپنی والد ماجد کیساتھہ چلی آتی اور مجکو دیکھہ جاتی . . . . تم جانو ، تم کو غیر سی جو رسم و راہ ہو ، آہ » (اردو: ٤۳٦) .

[۲٤۱ : ۱] مہر کو لکھتی ہیں : «پہلی تم سی یہ پوچھا جاتا ہی کہ برابر کئی خطوں میں تم کو غم و اندوہ کا شکوہ گزار پایا ہی . پس اگر کسی بیـدرد پر دل آیا ہی ، تو شکایت کی کیا گنجایش ہی ؟ بلکہ یہ غم تو ، نصیب دوستاں ، در خور افزایش ہی . بقول غالب ، علیه الرحمه :

کسی کو دیکے دل ، کوئی نواسنج فغاں کیوں ہو ؟
نہو جب دل ہی پہلو میں ، تو پھر منہ میں زباں کیوں ہو؟

ہی ، ہو ! حسن مطلع :

یہ فتنہ آدمی کی خانہ ویرانی کو کیا کم ہی !
ہوا تو دوست جس کا، دشمن اوس کا آسماں کیوں ہو؟

افسوس ہی کہ اس غزل کی اور اشعار یاد نہ آئی. اور اگر ، خدا نخواستہ باشد ، غم دنیا ہی ، تو بھائی ، ہماری ہمدرد ہو. ہم اس بوجھہ کو مردانہ اوٹھا رہی ہیں ، تم بھی اوٹھاؤ، اگر مرد ہو. بقول غالب مرحوم :

دلا ! یہ درد و الم بھی تو مغتنم ہی، کہ آخر
نہ گریۂ سحری ہی ، نہ آہ نیم شبی ہی (اردو: ۲٦۸ وعود : ۱۱۰).

[۲٤۳ : ٤] مہر کی نام کی خط میں ارشاد ہوتا ہی: «جناب مرزا صاحب ! دلی کا حال تو یہ ہی : گھر میں تھا کیا جو ترا غم ، آہ . یاں دھرا کیا ہی، جو کوئی لوٹی گا . وہ خبر محض غلط ہی » (ایضاً : ۲۷۰ وایضاً : ۱۳٤) ، نیز ۲۳٤ : ۱ ملاحظہ ہو.

[٤ : ۲٤٤] ملاحظہ ہو، ۲۲٤ : ۱ .

[۲ : ۲٤٦] ملاحظہ ہو، ۲۷۳ : ٥ .

[٤ : ۲٤۷] ملاحظہ ہو، ۲۳٦ : ٤ .

[۷ : ۲٤۹] اس کی ساتھہ یہ شعر بھی قابل ملاحظہ ہی :

غلط نہ تھا ، ہمیں خط پر گماں تسلی کا نہ مانی دیدۂ دیدار جو، تو کیونکر ہو؟

[٤ : ۲٥۰] میر مہدی کو لکھتی ہیں : «قرۃ العینین ، میر مہدی ومیر سرفراز حسین ، مجھہ سی ناخوش اور گلہ مند ہوں گی اور کہتی ہونگی کہ دیکھو، ہمیں خط نہیں لکھتا .

ہم بھی منہ میں زبان رکھتی ہیں کاش ! پوچھو کہ ماجرا کیا ہی

ماجرا یہ ہی کہ تمہارا ہی تو کوئی خط نہیں آیا ، میں جس کا جواب لکھتا» (اردو: ۱٦۰).

[۲ : ۲٥٤] ملاحظہ ہو، ۲۷٤ : ٤ .

[٥ : ۲٥٤] اسی کا ہم مضمون یہ شعر ہی :

ہم نشیں ! مت کہہ کہ « برہم کر نہ بزم عیش دوست »
واں تو میری نالی کو بھی اعتبار نغمہ ہی

[۳ : ۲٥٦] یہی مضمون اسطرح بھی نظم کیا ہی :

نظارہ کیا حریف ہو، اوس برق حسن کا، جوش بہار، جلوی کو جس کی نقاب ہی؟

[۱ : ۲٥۷] اس میں کوئی اشکال نہیں . جو لفظ ہیں ، وہی معنی ہیں . شاعر اپنا مقصود کیوں بتائی کہ میں کیا کرونگا ؟ مبہم کہتا ہی کہ کچہہ کرونگا . خدا جانی ، شہر میں یا نواح شہر میں تکیہ بنا کر، فقیر ہو کر، بیٹھہ رہی ، یا دیس چھوڑ، پردیس چلا جائی (خطوط : ۱۲۷:۱) .

[۲ : ۲۵۷] نواب انور الدوله بہادر، شفق، کو تحریر کیا ہی : «یہ دن مجھہ پر بری گزرتی ہیں . گرمی میں میرا حال بعینہ وہ ہوتا ہی، جیسا زبان سی پانی پینی والی جانوروں کا، خصوصاً اس تموز میں کہ غم و ہم کا ہجوم ہی. آتش دوزخ میں یہ گرمی کہاں، آہ » (اردو: ۳۱۱).

[۵ : ۲۵۷] میر مہدی مجروح کو لکھتی ہیں : «وبا کو کیا پوچھتی ہو؟ قدر انداز قضا کی ترکش میں یہی ایك تیر باقی تھا . قتل ایسا عام، لوٹ ایسی سخت، کال ایسا پڑا، وبا کیوں نہو؟ لسان الغیب نی دس برس پہلی فرمایا ہی: ہو چکیں، غالب، بلائیں سب تمام، آہ . میاں، سنہ ۱۲۷۷ کی بات غلط نہ تھی. مگر میں نی وبای عام میں مرنا اپنی لایق نہ سمجھا . واقعی اس میں میری کسر شان تھی . بعد رفع فساد ہوا سمجھہ لیا جائیگا » (اردو: ۱۸٦، و عود : ۹۰) .

[۲ : ۲۵۸] میرزا صاحب نی یہ اشعار لطیف احمد بلگرامی کی نام کی خط میں لکھی ہیں . فرماتی ہیں : «نظر ایجاد و تکوین، مولانا فضل حق ایسا دوست مر جائی، غالب نیم مردہ نیم جان رہجائی ! مرتی ہیں آرزو میں مرنی کی، آہ . آگی آتی تھی حال دل پہ ہنسی، آہ . اگر جوان ہوتا اور بیمار، تو آپ سی دعای خیریت چاہتا . اسی برس کا بڈھا ہونی آیا ہوں . دعای مغفرت کا امیدوار ہوں . شراب کمبخت اب بھی چھوٹتی نہیں . نماز کا اب بھی عادی ہوتا نہیں » (اردو: ٤۲۰، لاہوری ایڈیشن) .

[۲ : ۲٦۳] ملاحظہ ہو، ۳ :۲۰۵ .

[۲ : ۲٦٤] میرزا صاحب نی نواب انور الدولہ بہادر، شفق، کی خط میں یہ شعر نقل کیا ہی . فرماتی ہیں : پیر و مرشد ! بارہ بجی تھی، میں، ننگا اپنی پلنگ پر لیٹا ہوا، حقہ پی رہا تھا کہ آدمی نی آ کر خط دیا . میں نی کھولا، پڑھا . بھلی کو انگرکھا یا کرتا گلی میں نہ تھا . اگر ہوتا، تو میں گریبان پھاڑ ڈالتا . حضرت کا کیا جاتا؟ میرا نقصان ہوتا . سری سی سنیی . آپ کا قصیدہ بعد اصلاح بھیجا . اوسکی رسید آئی . کئی کئی ہونی شعر اولٹی آئی. اون کی قباحت پوچھی گئی . قباحت بتائی گئی . الفاظ قبیح کی جگہ بی عیب الفاظ لکھہدی گئی . لو، صاحب، یہ اشعار بھی قصیدی میں لکھہ لو . اس نگارش کا جواب آج تك نہیں آیا . شاہ اسرار الحق کی نام کا کاغذ اون کو دیا . جواب میں جو کچھہ اونھوں نی زبانی فرمایا، وہ آپ کو لکھا گیا . حضرت کی طرف سی اس تحریر کا بھی جواب نہ ملا :

پر ہوں میں شکوی سی یوں، راگ سی جیسی باجا
اك ذرا چھیڑیی، پھر دیکھیی، کیا ہوتا ہی ؟

سوچتا ہوں کہ دونوں خط بیرنگ گئی تھی . تلف ہونا کسی طرح متصور نہیں . خیر، اب بہت دن کی بعد شکوہ کیا لکھا جائی » (اردو: ۳۰۳ و عود: ٦۰) .
اسی خیال کو میرزا صاحب نی حسب ذیل شعروں میں بھی ادا کیا ہی:

ہوں سراپا ساز آہنگ شکایت ، کچھ نہ پوچھ
ہی یہی بہتر کہ لوگوں میں نہ چھیڑی تو مجھی

تم اپنی شکوی کی باتیں ، نہ کھود کھود کی پوچھو
حذر کرو مری دل سی ، کہ اس میں آگ دبی ہی

[٢٦٦ : ٦] ٢١ ستمبر سنہ ١٨٦٠ ع کو ، مولوی احمد حسن قنوجی کی خط میں لکھتی ہیں : « یہ درویش گوشہ نشین تمہارا دوست اور تمہارا دعا گو ہی . تمہاری نثر کی طرز پسند ، تمہاری خواہش مقبول ، جناب حکیم سید احمد حسن صاحب کی خدمتگزاری منظور . عشق نی ، آہ ، ٦٥ برس کی عمر ہوئی . اضمحلال قوی ، ضعف دماغ ، فکر مرگ ، غم عقبی . جو آپ مجھی دیکھہ گئی ہیں ، میں اب وہ نہیں ہوں » (اردو: ٢٣٩) .

میرزا تفتہ کی نام کی خط ، مورخۂ ٢٧ نومبر سنہ ١٨٦٢ ع ، میں یہ شعر بتغیر نقل ہوا ہی . میرزا صاحب لکھتی ہیں : « بھائی ! مجھہ میں کچھہ اب باقی نہیں ہی . برسات کی مصیبت گزر گئی ، لیکن بڑھاپی کی شدت بڑھہ گئی . تمام دن پڑا رہتا ہوں ، بیٹھہ نہیں سکتا . اکثر لیٹی لیٹی لکھتا ہوں . . . . . نواب صاحب کی دس پندرہ غزلیں پڑی ہوئی ہیں .
ضعف نی غالب نکما کر دیا ورنہ ہم بھی آدمی تھی کام کی (اردو: ٩٩) .

[٢٦٨ : ٣] « تقابل و تضاد کو کون نہ جانیگا ؟ نور و ظلمت ، شادی و غم ، راحت و رنج ، و وجود و عدم . لفظ « مقابل » اس مصرع میں بمعنیٔ مرجع ہی : جیسی ، حریف کہ بمعنیٔ دوست بھی مستعمل ہی . مفہوم شعر یہ کہ ہم اور دوست از روی خوی و عادت ضد ہمدگر ہیں . وہ میری طبع کی روانی دیکھہ کر رک گیا » (عود: ١٥٨) .

[٢٦٩ : ٣] در پردہ اونہیں غیر سی ہی ربط نہانی ظاہر کا یہ پردہ ہی کہ پردہ نہیں کرتی

[٢٦٩ : ٤] ملاحظہ ہو ، ٢٢٧ : ٣ .

[٢٦٩ : ٥] یوسف مرزا کو تحریر کیا ہی : « بھائی ! میں پہلی ہی جانتا تھا کہ یہ املاک قتل ہوئی ، اور وہ سوا لاکھہ روپیہ ، جو علاوہ زر مقررہ ملا ہی ، وہ دلی کی املاک کا خونبہا ہی . پرسوں ناظر جی کی نام کی سرنامی میں فرد فہرست مجموع املاک بھیج چکا ہوں . خیر ، یہ وار بھی خالی گیا - مولانا غالب ، علیہ الرحمہ ، خوب فرماتی ہیں : منحصر مرنی پہ ہو ، آہ » (اردو: ٣٤٧) .

سرورکو لکھتی ہیں : « حضرت ! سچ تو یوں ہی کہ غمہای روزگار نی مجکو گھیر لیا ہی . سانس نہیں لی سکتا ، اتنا تنگ کردیا ہی . ہر بات سو طرح سی خیال میں آتی ، پر دل نی کسی طرح تسلی نپائی . اب دو باتیں سوچا ہوں : ایك تو یہ کہ جبتك جیتا ہوں ، یونہی رویا کرونگا ؛ دوسری یہ کہ آخر ایك نہ ایك دن مرونگا . یہ صغری و کبری دلنشین ہی . نتیجہ اس کا تسکین ہی . ہیہات ! منحصر مرنی پہ ہو ، آہ » (ایضاً : ١٤٧) .

[۲۷۱ : ٦] اس کی ساتھه یه شعر بھی قابل ملاحظه ھی :

نہیں معلوم ، کس کس کا لہو پانی ہوا ہوگا   قیامت ھی، سرشك آلوده ھونا تیری مژگان کا

اس غزل کی شان نظم کی باری میں میرزا صاحب لکھتی ھیں : « پچاس برس کی بات ھی که الٰھی بخش خان مرحوم نی ایك زمین نئی نکالی ۔ میں نی حسب الحکم غزل لکھی ۔

بیت الغزل یه :   پلادی اوك سی ساقی ، آه ،   مقطع یه :

اسد ، خوشی سی مری ھاتھه پانو پھول گئی   کہا جو اوس نی : «ذرا میری پانو داب تو دی »

اب میں دیکھتا ھوں که مطلع اور چار شعر کسی نی لکھه کر ، اس مقطع اور اوس بیت الغزل کو شامل اون اشعار کی کرکی ، غزل بنائی ھی اور اوس کو لوگ گاتی پھرتی ھیں ۔ مقطع اور ایك شعر میرا ، اور پانچ شعر کسی الو کی ۔ جب شاعر کی زندگی میں گانی والی شاعر کی کلام کو مسخ کر دیں ، تو کیا عجب ھی که دو شاعر متوفی کی کلام میں مطربوں نی خلط کر دیا ھو » (اردو: ٤٤٢)۔

[۲۷۳ : ٥] ملاحظه ھو، ۲٤٦ : ۲ ۔

[۲۷٤ : ٤] ملاحظه ھو، ۲٥٤ : ۲ ۔

[۲۷٦ : ۳] ملاحظه ھو، ۲۸۸ : ۱ ۔

[۲۷۹ : ٥] ۷ فروری سنه ۱۸٥۸ع کو مجروح کی خط میں فرماتی ھیں : « میرا حقیقی بھائی ، میرزا یوسف خان دیوانه ، بھی مرگیا ۔ کیسا پنسن ، اورکہاں اوس کا ملنا ؟ یہاں جان کی لالی پڑی ھیں ۔ ھی موجزن اك قلزم خوں ، آه » (اردو: ١٥٦)۔

[۲۷۹ : ۷] «کیا کہیں ، بھلا کہیں ، یه زمین ایك بار یہاں طرح ھوئی تھی ۔ مگر بحر اور ھی تھی ۔ کہوں جو حال ، آه » (اردو: ۲٦٨ و عود : ۱۱۱) ۔

[۲۸۰ : ۲] شاکر کی استفسار پر میرزا صاحب نی تحریر کیا ھی :

زخم نی داد نه دی تنگیء دل کی ، یا رب !   تیر بھی سینهٔ بسمل سی پر افشاں نکلا

یه ایك بات میں نی اپنی طبیعت سی نئی نکالی ھی ، جیسا که اس شعر میں : نہیں ذریعهٔ راحت ، آه ۔ یعنی : زخم تیر کی توصیف ، بسبب ایك رخنه ھونی کی ، اور تلوار کی زخم کی تحسین ، بسبب ایك طاق سا کھل جانی کی ۔ زخم نی داد نه دی تنگیء دل کی ، یعنی زایل نه کیا تنگی کو ۔ پرافشاں ، بمعنیء بیتاب ، اور یه لفظ تیر کی مناسب ۔ حاصل یه که تیر تنگیء دل کی داد کیا دیتا ؟ وه تو خود ضیق مقام سی گھبرا کر ، پرافشاں اور سراسیمه نکل گیا » (عود : ١٦١) ۔

[۲۸۲ : ٥] اس کی ساتھه ملاحظه ھو، ۲٥٦ : ۳ ، نیز یه بیت :

نظاره کیا حریف ھو ، اوس برق حسن کا ؟   جوش بہار ، جلوه کو جس کی نقاب ھی

[۲۸٤ : ۱] اس غزل کی متعلق ۲۲ ستمبر سنه ۱۸٦٥ ع کو علائی کو تحریر کیا ھی : « تم نی اشعار جدید مانگی ۔ خاطر تمہاری عزیز ۔ ایك مطلع ، صرف دو مصرعی ، آگی کی کہی ھوی یاد آ گئی که وه داخل دیوان بھی نہیں ۔ اون پر فکر کرکی ، ایك مطلع اور پانچ شعر لکھه کر ، سات بیت کی ایك غزل تم کو بھیجتا ھوں ۔

بھائی ! کیا کہوں کہ کس مصیبت سی یہ چھہ بیتیں ھاتھہ آئی ھیں اور وہ بھی بلند رتبہ نہیں . . . . . لو، صاحب، تمھارا فرمان قضا توأمان بجا لایا . مگر اس غزل کا مسودہ میری پاس نہیں ھی. اگر باحتیاط رکھوگی اور اردو کی دیوان کی حاشیے پر چڑھا دوگی ، تو اچھا کروگی» (اردو: ۳۹۳) .

عرشی عرض کرتا ھی کہ اردوی معلی میں اس مطلع کی مصرعوں میں تقدم و تاخر ھی : نیز چار شعر مطبوعہ دیوان سی زاید ھیں .

[۲۸٤ : ۲] مرزا حاتم علی مہر کی نام کی خط میں ، یہ مقطع اور مطلع ثانی

بہت سہی غم گیتی ، شراب کم کیا ھی؟ غلام ساقی کوثر ھوں ، مجکو غم کیا ھی؟

لکھا ھی (ایضاً : ۲٤۸) .

[۲۸۵ : ۱] علائی کی محولۂ سابق خط میں : « تاب لائی ھی بنیگی غالب ، » کیساتھہ یہ مطلع بھی لکھا ھی (اردو: ۳۹۳) .

[۲۸۷ : ۵] یہی مضمون اس شعر میں بھی نظم کیا ھی :

دل و مژگاں کا جو مقدمہ تھا آج ، پھر ، اوس کی روبکاری ھی

[۲۸۸ : ۱] ملاحظہ ھو، ۲۷٦ : ۳ .

[۲۸۸ : ۲] علائی کو لکھتی ھیں : « اپنا یہ مصرع بار بار پڑھتا ھوں :

ای مرگ ناگہاں ، تجھی کیا انتظار ھی؟

مرگ اب ناگہانی کہاں رھی؟ اسباب و آثار سب فراھم ھیں . ھای ! الھی بخش خان مغفور کا کیا مصرع ھی : آہ ! جی جاؤں ، نکل جاؤ اگر جان کہیں ، آہ » (اردو: ٤۲۳).

تفتہ کو لکھا ھی: « میرا حال اس فن میں اب یہ ھی کہ شعر کہنی کی روش اور اگلی کہی ھوی اشعار، سب بھول گیا . مگر ھاں ، اپنی ھندی کلام میں سی ڈیڑھہ شعر، یعنی : ایك مقطع اور ایك مصرع ، یاد رہ گیا ھی. سو گاہ ، گاہ ، جب دل اولٹنی لگتا ھی، تب دس پانچ بار یہ مقطع زبان پر آجاتا ھی:

زندگی اپنی جب اس شکل سی گزری ، غالب ہم بھی کیا یاد کرینگی کہ خدا رکھتی تھی!

پھر جب سخت گھبراتا ھوں اور تنگ آتا ھوں ، تو یہ مصرع پڑھکر چپ ھوجاتا ھوں :

ای مرگ ناگہاں ! تجھی کیا انتظار ھی؟ » (ایضاً : ۱۲٤ و عود : ۱۰۰) .

[۲۸۸ : ٤] ۵ ستمبر سنہ ۱۸٦٦ ع کو سیاح کو تحریر کیا ھی: « تم برا نہ مانو . کسواسطی کہ اگر میں برا ھوں ، تو اوس نی سچ کہا ، اور اگر میں اچھا ھوں اور اوس نی برا کہا ، تو اوس کو خدا کی حوالی کرو. غالب ، برا نہ مان ، جو دشمن برا کہیں ، آہ » (اردو: ۲۳) .

[۲۸۹ : ۱] ملاحظہ ھو، ۲۳۵ : ۵ . یہ شعر بھی اس کا ہم مضمون ھی:

آتا ھی داغ حسرت دل کا شمار یاد مجھہ سی مری گنہ کا حساب ، ایخدا ، نہ مانگ

[۲۸۹ : ۵] ملاحظہ ھو، ۲۱۲ : ٦ .

[۲۹۰ : ۲] دیکھو یہ «پرہ» کا مخفف «پہ» ھی بمعنیٰ لیکن (اردو: ۳۸٦، لاھوری ایڈیشن، ۴۳۷ع).
[۲۹۱ : ٤] ملاحظہ ھو، ۱۹۹ : ۱، ۲۳٦ : ۳، ۲۳۷ : ۷.

مثنوی

[۳۰٦ : ٤] میرزا صاحب نے آم کی تعریف میں جو لطیف تشبیہیں اور پاکیزہ استعاری استعمال کیے ھیں، اردو ادب میں اون کی مثال ملنا دشوار ھی. مگر ابو المکارم امیر خان حسینی هروی نے فارسی میں ایك مثنوی آموں کی تعریف میں لکھی تھی. مناسبت مقام کا تقاضا ھی کہ اوس کے چند شعر یہاں ضرور نقل کیے جائیں. وہ فرماتے ھیں:

ز وصف انبہ، چون گویم کہ چونست؟	کہ از رشك شرابش، شہد خونست
ز نام او، چو گیرم لذت قند	زبان با کام، و لب با لب، شود بند
بسختی، همچو لعل، اما شکر بار	بنرمی، چون طلای دست افشار
بطفلی، چون دل معشوق، تنگ است	بہ پیری، چون رخ من، زرد رنگ است
ز شیرین کاریش، چون خل عسل شد	زمرد با زر و یاقوت حل شد
شرابش بہتر از شیر و شکر هست	گہی هم رنگ سیم و گاہ زر هست
بصورت مردم و جایش بر اشجار	کلیم آرزو را شعلۂ نار

(معلومات الآفاق: ٤٤، طبع نولکشور پریس، سنہ ۱۸۷۳ع).

قطعات

[۳۱۵ : ٦] ۲۰ جولائی سنہ ۱۸٦۰ع کو تفتہ کے خط میں لکھا ھی: «اب میری کہانی سنو. آخر جون میں صدر پنجاب سے حکم آ گیا کہ پنسنداران ماہ بماہ نہ پائیں، سال میں دو بار، بطریق ششماھہ، فصل بفصل پایا کریں. ناچار، ساھوکار سے سود کاٹ کر روپیہ لیا گیا، تا رامپور کی آمد میں مل کر صرف ھو. یہ سود چھہ مہینے تك اسی طرح کثوان دینا پڑیگا. ایك رقم معقول گھاٹے میں جائے گی: رسم ھی مردہ کی چھماھی ایك، آہ» (اردو: ۷٤).



اختلاف نسخ ـ فارسی

[اس حصے میں پہلے ہندسے صفحات کو اور دوسرے سطروں کو ظاہر کرتے ہیں . مگر سطریں شمار کرتے وقت غزلوں کے عنوان چھوڑ دیے گئے ہیں .

فارسی متن کے مقابلے اور تصحیح میں ، حسب ذیل چار نسخے پیش نظر رہے ہیں .

آ : دیوان فارسی کے انتخاب کا وہ قلمی نسخہ ، جو میرزا صاحب نے ستمبر سنہ ١٨٦٦ع میں نواب خلد آشیان (طاب ثراہ) کی خدمت میں نذر گزرانا تھا . اس کے صفحات ٥-٩ میرزا صاحب کے اپنے قلم کے مکتوبہ ہیں .

ب : کلیات فارسی کا وہ قلمی نسخہ ، جو میرزا صاحب کی طرف سے مارچ سنہ ١٨٦١ع میں ، نواب فردوس مکان (طاب ثراہ) کے حضور میں ڈاك کے ذریعے سے پیش ہوا . خود میرزا صاحب کی تصریح کے مطابق ، یہ نسخہ نواب فخر الدین خان مرحوم کے قلم کا لکھا ہوا ہے .

ج : کلیات فارسی کا پہلا مطبوعہ نسخہ ، جو سنہ ١٢٦١ ھ (١٨٤٥ع) میں مطبع دارالسلام دهلی میں چھپا ؛ اس ایڈیشن کی ایك کاپی ڈاکٹر عبد الستار صاحب صدیقی (الہ آباد) کے پاس ، اور اس ایڈیشن کی ایك پرانی نقل کتابخانۂ عالیۂ رامپور میں محفوظ ہے . ڈاکٹر صاحب کے نسخے میں آخری دو صفحے غایب ہیں . مگر نسخۂ رامپور کے خاتمے سے معلوم ہوتا ہے کہ اس کے اشعار کی تعداد ٦٦٧٢ ہے .

د : کلیات فارسی کا وہ مطبوعہ نسخہ ، جو منشی نولکشور کے اہتمام سے ، ١٢٧٩ ھ (١٨٦٣ع) میں چھپ کر شایع ہوا . اس نسخے کے خاتمے میں اشعار کی تعداد ١٠٤٢٤ ظاہر کی گئی ہے .]

١١ : ٩ ، آ : تمام قلمی اور مطبوعہ نسخوں کے برخلاف ، آ میں اس جگہ غزلوں کی ترتیب مختلف ہے . چونکہ قرینے سے ثابت ہوتا ہے کہ یہ کاتب کے سہو کا نتیجہ ہے ، بنابریں ب ، ج وغیرہ کے مطابق ، ترتیب غزلیات کو درست کردیا گیا ہے .

١٢ : ١١ ، ب ، ج ، د : «زحمت عام» .

١٣ : ١٠ ، د : «کردم» .

١٦ : ١٠ ، د : «افشاند» .

٢٣ : ٦ ، آ : «کن» ندارد .

٢٤ : ٦ ، آ : «دهن ما بزبان خط به پیمانهٔ ما» .

٢٤ : ٧ ، آ : «ای گل از نقش پائی دامان ترا» .

٢٤ : ٨ ، ب ، ج ، د : «کرده» .

٢٤ : ٩ ، آ : «تا بخون که» .

٢٥ : ١ ، د : «چشم» .

٢٥ : ٣ ، آ : «از سیلی» .

٢٥ : ٥ ، آ : «گزارد مغز جانان را» .

٢٥ : ١٢ ، آ : «خامان را» .

٢٨ : ٦ ، آ : «از رخ» .

۲۸ : ۱۰ ، آ: «نم از خم» .
۲۹ : ۸ ، آ: «گزند تست» .
۲۹ : ۹ ، آ: «بجبر» .
۳۱ : ۳ ، آ: «بر آنچه» .
۳۸ : ۱ ، ب: «ساختیم» .
۳۸ : ۹ ، ب، ج: «اگر» .
۴۰ : ۴ ، آ: «درگمان» .
۴۸ : ۴ ، آ: «باده مینا» .
۵۰ : ۲ ، د: «آب از رخ» .
۵۴ : ۳ ، آ: «رماده» (بضم رای مہملہ) .
۶۲ : ۱ ، سبد چین ؛ کار. (یہ شعر دیوان کی کسی نسخی مین موجود نہیں .)
۶۵ : ۸ ، ب: «محیطست گران هیچ» .
۶۷ : ۶ ، آ: «گذاشت» .
۶۸ : ۲ ، آ، ج: «زهرآب» .
۷۶ : ۱۱، آ: «سبکساری» .
۸۰ : ۵ ، د: «خوشه» . (اس کی بعد والی اڈیشن مین «خوشا» هی .)
۸۰ : ۹ ، آ: «بنوبت بمن» .
۸۳ : ۸ ، د: «خواب ناز» .
۸۶ : ۱۱، ب: «جهنم» (بضم نون) .
۸۸ : ۹ ، ب، ج: «نشئه» .
۹۸ : ۵ ، آ: «سخنم» .
۱۰۰ : ۱۱، ب: «میگردی» . (آ مین بهی اسیطرح تها . لیکن تصحیح کی وقت میرزا صاحب نی گاف کا ایک مرکز چاقو سی چهیل دیا هی .)
۱۰۱ : ۳ ، ب: «بالید آشیان که شد» .
۱۰۱ : ۷ ، آ، د: «بمرگ من یاد آر» .
۱۰۲ : ۸ ، آ: «سیه» ندارد .
۱۰۶ : ۳ ، آ: «بیاموز» (صرف ایک جگه) .

۱۰۷ : ۳ ، ج، د: «بیاسودن» .
۱۰۷ : ۸ ، آ: «گاهی گاهی» .
۱۰۸ : ۵ ، ب: «کاشانه گزین» .
۱۱۲ : ۱۲، آ: «بری» .
۱۱۳ : ۹ ، آ: «گر» .
۱۱۴ : ۸ ، آ: «جان را» .
۱۱۵ : ۴ ، ب، ج، د: «گو» . (آ مین بهی اسیطرح تها . لیکن ایک مرکز میرزا صاحب نی چهیل دیا هی .)
۱۱۶ : ۲ ، ب، ج، د: «کاین» . (آ مین بهی اسیطرح تها . لیکن میرزا صاحب نی «ی» کا شوشه چهیل دیا هی .)
۱۲۰ : ۹ ، د: «بآموزگار هم» . (آ مین بهی اسیطرح تها . لیکن میرزا صاحب نی «ه» کو چهیل کر اوس کی جگه «ی» لکهی هی .)
۱۲۱ : ۱۰، آ: «آزاری من» .
۱۲۵ : ۵ ، آ: «گرانه» .
۱۲۸ : ۱ ، ب، ج، د: «روزگاران» .
۱۲۸ : ۵ ، ب: «کدامی» .
۱۲۸ : ۶ ، آ: «انتظار داشتم» .
۱۳۰ : ۵ و۶، یه شعر کسی قلمی اور مطبوعه نسخی مین نہین پایا جاتا .
۱۳۱ : ۲، آ: «درحلقهٔ کشاکش آهش گرفته ایم» . (تمام نسخون کی مطابق ، یه مصرع غزل کی آتهوین بیت سی تعلق رکهتا هی .)
۱۳۶ : ۳، آ، د: «تازگیان» .
۱۳۸ : ۲، آ: «گردان» .
۱۳۸ : ۵، آ: «و نندیشیم» .
۱۴۸ : ۶، ب، ج، د: «همچون» .
۱۴۸ : ۱۱، آ: «چنین» (دونون جگهون پر) .
۱۵۱ : ۸ ، آ: «زورین کمانان» .

۱۵۳ : ۹ ، آ: «جحیم» .
۱۵٤ : ۷ ، آ: «یارت» .
۱۵۵ : ۱۲ ، ب : «طاقت هفتاد سال» .
۱۵۹ : ۱ ، آ: «شاهان» .
۱٦۲ : ٤ ، ب ، ج: «دل گم گشته» .
۱٦۳ : ۱ ، آ: «دورفت» .
۱٦٦ : ۲ ، آ: «ده» ندارد .
۱٦۷ : ۵ ، آ: «تو» ندارد .
۱۷۰ : ۲ ، ب: «خلخ» (بفتح لام مشدد) .
۱۷۱ : ۳ ، آ ، ب ، : «گوئی» و آ: «نشنوی» .
۱۷٦ : ٤ ، ب ، ج: «نشهٔ» .
۱۷٦ : ۸ ، د: «بابم» .
۱۷۷ : ۱۱ ، آ: «در جلوه» .
۱۷۹ : ب ، ج: «رباعی ۸» ندارد .
۱۸۱ : ۱۱ ، ب: «لطف و گرمی» .
۱۸۲ : ٦ ، ب: «در زلف» .



اختلاف نسخ۔ اردو

[اردو متن کی مقابلی اور تصحیح میں، حسب ذیل آٹھ نسخوں سی مدد لی گئی ھی:

آ : دیوان اردو کی انتخاب کا وہ نسخہ، جو ستمبر سنہ ۱۸۶۶ ع میں، میرزا صاحب نی نواب خلد آشیان (طاب ثراہ) کی خدمت میں ھدیۃ پیش کیا. اس کی صفحات، ۶، ۱۲، ۱٤، وغیرہ پر میرزا صاحب کی قلم کی اصلاحیں پائی جاتی ھیں.

ب : دیوان اردو کا وہ قلمی نسخہ، جسی میرزا صاحب نی مئی سنہ ۱۸۵۷ ع میں نواب فردوس مکان (طاب ثراہ) کی حضور میں بذریعۂ ڈاك ارسال کیا تھا. اس کی آخر میں نواب ضیاء الدین احمد خان بہادر کی تقریظ بھی شامل ھی، جو دراصل سنہ ۱۲۵٤ ھ (۱۸۳۹ع) میں لکھی گئی تھی؛ لیکن زیر نظر نسخی میں اس کی تاریخ بدل کر ۱۲۷۱ھ بنا دی گئی ھی. اس تقریظ کی مطابق، اشعار کی تعداد ۱٦۹۰ اور کچھہ ھی. اس نسخی میں بھی میرزا صاحب کی قلم کی اصلاحیں موجود ھیں.

ج : دیوان اردو کا وہ مطبوعہ نسخہ جو شعبان ۱۲۵۷ ھ (اکتوبر سنہ ۱۸٤۱ ع) میں، سید محمد خان بہادر کی چھاپی خانی، واقع شہر دھلی، میں طبع ھوکر شایع ھوا تھا. اس کی آخر میں بھی مذکورۂ بالا تقریظ ھی؛ لیکن اوس کی تاریخ تحریر ۱۲۵٤ ھ اور تعداد اشعار ۱۰۹۸ ھی. اس ایڈیشن کی ایك کاپی پبلك لائبریری، رامپور، میں اور اوس کی پرانی قلمی نقل، جس میں ناقل نی سرورق کی عبارت بھی نقل کی ھی، کتابخانۂ سرکاری میں موجود ھی.

د : دیوان اردو کا وہ نسخہ جو مئی سنہ ۱۸٤۷ ع (۱۲٦۳ ھ) میں مطبع دارالسلام دھلی سی شایع ھوا. اس کی آخر میں بھی مذکورۂ بالا تقریظ شامل ھی. فرق صرف اسقدر ھی کہ تعداد اشعار «یکہزار و یکصد و اند» بنا دیگئی ھی.

اس ایڈیشن کی ایك کاپی یونیورسٹی لائبریری، دھلی، میں محفوظ ھی. آجکل اس کی نقل کتابخانۂ عالیۂ رامپور کیلئی تیار کی جا رھی ھی. اس نسخی کا ۱۵ سطری مسطر اور تعداد صفحات ۹۸ ھی. ھاں، زیر نظر نسخی میں صفحات ۵-۸ ندارد ھیں.

ہ : دیوان اردو کا وہ نسخہ، جو ۲۰ محرم سنہ ۱۲۷۸ ھ (۱۸٦۱ ع) کو دھلی کی مطبع احمدی میں، باھتمام امو جان طبع ھوا. اس کی آخر میں میرزا صاحب کی ایك تحریر بعنوان «عبارت خاتمۂ دیوان» چھپی ھی. اس سی معلوم ھوتا ھی کہ میرزا صاحب نی اس کی کاپیوں کی خود تصحیح کی تھی. لیکن لفظ «کسی» کی جگہ «کسو» کاتب نی اتنی مقامات پر لکھہ دیا تھا کہ آخر تھك کر میرزا صاحب نی اوسی علیٰ حالہ چھوڑ دیا.

و : دیوان اردو کا وہ نسخہ، جو نسخۂ د سی ذیحجہ سنہ ۱۲۷۸ ھ میں، کانپور کی مطبع نظامی میں چھپا. نسخۂ آ در اصل اسی سی نقل کیا گیا ھی.

ز : دیوان اردو کا وہ نسخہ، جو منشی شیونراین نے اپنے مطبع مفید خلایق، آگرہ، میں سنہ ۱۸۶۳ع میں چھاپ کر شایع کیا. اس نسخے کی ترتیب نسخۂ ب کے مطابق ہے.

ح : دیوان اردو کا وہ نسخہ، جو نظامی پریس، بدایوں، سے سنہ ۱۹۲۳ع میں شایع ہوا. اس نسخے کی تصحیح میں نسخۂ ب سے مدد لی گئی ہے.]

۱۸۷ : ۸، آ، ج، ہ، و: «ایك».

۱۸۷ : ۱۰، ہ: «ہر ایك قطرۂ خوں». (میرزا صاحب نے نواب فردوس مکان، ناظم، کے مصرع: «یوں تو ہو جاتا ہے ہر ایك عیش و عشرت کا شریك» میں «ہریك» بنا کر لکھا ہے: «جہاں «ہر ایك» اچھی طرح نہ آئے، وہاں «ہریك» لکھیے، «ہر ایك» کیوں لکھیے». نیز پچیسویں غزل کے تیسرے شعر میں کاتب نے «ہرایك» لکھا تھا. اسے خود میرزا صاحب نے، الف کاٹ کر، «ہریك» بنایا ہے.)

۱۹۰ : ۶، آ، د: «ہرایك». ب، ج، ہ: «ہریك». ز، ح: «ہرالك».

۱۹۰ : ۱۴، آ، ج، د، ہ، و: «ایك». ب، ز: «الك». (میرزا صاحب نے نواب فردوس مکان، ناظم، کے مصرع: «رکھتے ہیں ابھی اك دل ہنگامہ گزیں ہم» کے مقابل حاشیہ پر لکھا ہے: «یہاں «ایك» کی جگہ «اك» درست ہے، مگر «ہر» کے ساتھ «ہریك» ہو، نہ «ہرالك».»)

۱۹۱ : ۶، آ: «جاں دادۂ جاں ہوای».

۱۹۲ : ۶، ب، ج، د، ہ: «یك دیوان».

۱۹۲ : ۸، ح: «بھرنے تلك».

۱۹۵ : ۱۱، آ، و: «خونناب». (اسی طرح آ اور و میں ہر جگہ پایا جاتا ہے.)

۱۹۶ : ۵، آ، ب، د، ہ: «نگہت».

۱۹۶ : ۱۱، ب: «سب کے ہے دل میں جگہ».

۱۹۷ : ۱، ب، ہ: «تنہا». ز: «تہا».

۱۹۸ : ۴، آ، و: «اوس کی».

۱۹۹ : ۶، آ: «ڈوبا».

۲۰۰ : ۶، آ: «پھرا تیرا».

۲۰۲ : ۶، آ، و، ز: «خورشید». (میرزا صاحب نے ایك مکتوب میں صراحت کر دی ہے کہ لفظ «خور» کو تنہا «خور» اور باضافۂ «شید» «خرشید» لکھنا چاہیے. اسلیے ہر جگہ بحذف و لکھا گیا ہے.)

۲۰۳ : ۱، آ: «آینہ».

۲۰۳ : ۸، ب، د، ز: «دست وخنجر قاتل».

۲۰۴ : ۱۲، آ، و: «ننگ سجدے سے».

۲۰۷ : ۳، ہ: «دیداں». (آ میں بھی اسیطرح تھا. لیکن میرزا صاحب نے اپنے قلم سے درست کر دیا ہے.)

۲۱۱ : ۱۰، آ: «بادۂ ساغر».

۲۱۲ : ۷، آ: «آپ» ندارد.

۲۱۳ : ۶، آ: «آتش پرستی ہے».

۲۱۳ : ۹، آ: «اور». (ہر جگہ بضمۂ الف لکھا ہے.)

۲۱۳ : ۱۰، آ: «کماں اور».

۲۱۷ : ۸، ح: «ہونے تك». (اسیطرح تمام جدید الطبع نسخوں میں پایا جاتا ہے. لیکن یہ جدید محاورہ ہے. پرانا محاورہ وہی ہے، جو تمام قدیم قلمی و مطبوعہ

نسخوں میں لکھا گیا ہے .)

۲۱۸ : ۱ ، د : « پیش » .

۲۲۰ : ٤ ، ب ، ج ، د ، ہ : « ذرہ » .

۲۲۰ : ۸ ، و : « گراك » .

۲۲۱ : ۱۰ ، آ : « چہرہ » .

۲۲۱ : ۱۲ ، د : « پای طلب » .

۲۲۳ : ٤ ، آ ، ہ ، و : « میری پانوں » . ز : « پاوں » .

۲۲۳ : ۱۰ ، آ : « کھل » (بضمۂ کاف) .

۲۲٤ : ۵ ، ب ، د ، ہ : « یك قد آدم » .

۲۲٦ : ۸ ، ب ، ہ : « ھر یك » .

۲۲۸ : ۵ ، د : « بوسست » .

۲۲۸ : ۸ ، آ : « جای وھیں » .

۲۳۰ : ۲ ، آ : « مضمون کرے » .

۲۳٤ : ۱۲ ، ب ، ز : « اور کو آزمائی کیوں » .

۲۳۵ : ٦ ، ب ، ج ، د ، ہ : « آوی وہ یہاں » . ز : « آئی وہ یہاں » .

۲۳٦ : ٤ ، ب ، ز : « ٹھہرا » . ھ : ٹھیرا » .

۲۳۹ : ۱ ، آ ، د ، ہ : « وھاں » . (میرزا صاحب نے اصل میں اپنے قلم سے « واں » بنایا ہے؛ اسلیے ھر جگہ بحذف « ہ » لکھا گیا ہے . لیکن قبل ازیں ، نواب فردوس مکاں ، ناظم ، کے مصرع : « سیاح جہاں گرد میں ، آنکلے یہاں بھی » پر لکھا ہے : « یہاں ، بروزن دھاں فصیح نہیں . بے ضرورت نہ چاہیے . « یہاں » بہ یای مختلط التلفظ افصح ہے » . اس سے معلوم ہوتا ہے کہ آخر میں انہوں نے املا میں ترمیم کرلی تھی .)

۲٤۱ : ۷ ، ب ، ہ : « ٹہرا » .

۲٤۲ : ۲ ، آ : « آنکہوں » . ج : « بہو » .

۲٤۳ : ۳ ، آ : « تہا » .

۲٤٤ : ۵ ، د : « ستمزدگوں » .

۲٤٤ : ۸ ، ب ، ج ، د ، ہ ، و : « ذرہ » . ز : « ذری » . (آ میں بھی ذرہ لکھا تھا . لیکن میرزا صاحب نے اپنے قلم سے « ہ » کی جگہ « ی » لکھی ہے .)

۲٤۵ : ۱ ، د : « برشگال » .

۲٤۵ : ٦ ، ب : « تسکین کو نوید » . (ہ میں بھی اسیطرح لکھا تھا . لیکن غالباً کاپی کی تصحیح کے وقت میرزا صاحب نے لفظ « دی » کا سطر کے اوپر اضافہ کرایا ہے .)

۲٤۸ : ۸ ، آ ، ب ، ج ، د ، ہ : « نگہت » .

۲٤۹ : ٦ ، آ ، ہ ، و : « سینکڑوں » .

۲٤۹ : ۱٤ ، آ : « تری » .

۲۵۲ : ۵ ، ب ، ہ ، و ، ز : « اپنا نہیں وہ شیوہ » . (آ میں بھی اسیطرح تھا . میرزا صاحب نے اپنے قلم سے یہ تغیر کیا ہے .)

۲۵۵ : ۱۰ ، آ : « اس » .

۲۵۵ : ۱۲ ، د : « دونو » .

۲۵۹ : ۱٤ ، ب : « فردوس ھوش ہے » .

۲٦۰ : ۲ ، آ : « نہ وہ سرور و ســوز » . و : « سرور و سوز » .

۲٦۲ : ۱ ، ب : « دل ناداں » .

۲٦۲ : ۹ ، ب ، ز : « رونق منہ پر » .

۲٦۳ : ۳ ، ج : « یعنی » . (بعض مطبوعــہ نسخوں میں « بنی » لکھا ہے .)

۲٦۵ : ۷ ، آ : « نہیں » ندارد .

۲٦۸ : ۲ ، د : « خونناب » .

۲٦۸ : ۱۲ ، آ : « آئی » .

۲٦۹ : ۱۱ ، ب ، د ، ہ ، ز : « مجسم » . (ھر ردیف اسیطرح ہے .)

۲۷۰ : ۲ ، ب ، ج ، د : « دود کی طرح » (ہ

میں بھی اسیطرح تھا ۔ لیکن صحت نامی میں «صورت دود» بنایا گیا ھی) ۔

۲۷۵ : ٦ ، آ: «کئی» . ہ ، و: «ھی» .

۲۷۷ : ۵ ، ب ، د ، ہ ، ز : «مجسی» (ھر ردیف اسیطرح ھی) .

۲۷۸ : ٤ ، ب ، ہ ، و: «شانہ» . (آ میں بھی اسیطرح تھا . لیکن میرزا صاحب نی اپنی قلم سی «شانی» بنایا ھی.)

۲۸۰ : ۱۰ ، آ ، و: «کہیں» .

۲۸۱ : ٦ ، آ: «دھونی گئی» .

۲۸۲ : ٤ ، ب ، د ، ہ ، و ، ز : «تجسی» .

۲۸۲ : ١٤ ، ب ، د ، ہ : «ھات» .

۲۸۵ : ٦ ، ب : «کوچہ» .

۲۸۷ : ٤ ، آ ، د ، ہ : «میری» . و د : «بیجاں کی» .

۲۸۸ : ۲ ، آ ، ب ، د ، ہ ، و : «یہاں» .

۲۸۹ : ۷ ، ہ : «گر» . (آ میں بھی اسی طرح تھا . میرزا صاحب نی اصلاح کر دی ھی.)

۲۸۹ : ۷ ، ب ، ہ : «وھاں» .

۲۹۳ : ۱ ، ج : «منتخب قصیدۂ منقبت علی مرتضی رضی اللہ تعالی عنـــہ» . و د : «افزایش آبروی گوھر سخن بہ ثنـای ابو الأئمـہ حضرت علی مرتضی ، علیہ التحیۃ والثنا» (عنوان قصیدۂ ۱) .

۲۹٤ : ۱ ، ج : «انتخاب قصیدۂ منقبت علی مرتضی علیہ الســلام» . و د : «ایضاً فی المنقبۃ» (عنوان قصیدۂ ۲) .

۲۹٤ : ۱۱ ، آ: «ھو» .

۲۹۵ : ١٤ ، آ: «ترا» .

۲۹۸ : ۳ ، آ: «می» .

۳۰۳ : ۱۳ ، ب ، ز : «دکھادوں گا» .

۳۰۵ : ۳ ، ب ، ج ، ہ ، و: «خامہ نی پائی طبیعت سی مدد» . (آ میں بھی اسیطرح تھا . لیکن میرزا صاحب نی اپنی قلم سی ترمیم کی ھی.)

۳۰۵ : ۳ ، ح : «بادباں کی اٹھتی ھی» .

۳۰۸ : ۱۲ ، آ ، ہ ، و : «بھیجیں ھیں» .

۳۰۹ : ۵ ، ہ ، و: «یکبار» . ب: «ایك بار» .

۳۱۱ : ۲ ، آ: «بی شبہ عدیل» .

۳۱۲ : ۱ ، آ: «تری» .

۳۱۲ : ۳ ، آ: «ترا» .

۳۱۲ : ٦ ، آ ، ہ ، و ، ح: «چاھا» .

۳۱۲ : ۱۲ ، آ ، و ، ز ، ح : «امر» . ب ، ہ ، ز: «عمر» .

۳۱۳ : ۷ ، ج ، د: «قطعـہ در نمایش عنوان دلاویزی گفـتار ، و آسان کردن اندوہ پشیمانی بر دل دلدار» . (یہ دوسری قطعی کا عنوان ھی . د میں «بر نمایش» ھی.)

۳۱۵ : ۱۳ ، و ، ح : «تو» . (آ میں بھی اسیطرح تھا . میرزا صاحب نی اپنی قلم سی «تو» کاٹ کر «کہ» بنایا ھی.)

۳۱٦ : ۳ ، آ: «مری» .

۳۱٦ : ۳ ، ب ، ز: «چہارم کا» .

۳۱۷ : ۷ ، ب ، ز: «کاغذ باد کی طرح» .

أشاریه

اشاریه

انتخاب غالب

تنبیہ: براہ کرم متن کتاب میں حسب ذیل غلطیوں کی اصلاح فرما لی جائے:

ص	سطر	غلط	صحیح
ص ۱۸۶ ،	سطر ۱۱	اٹھایا	اُٹھایا
۱۹۱	۲	اس کے	اُس کے
۱۹۵	٦	الٹے	اُلٹے
۱۹۸	٤	اُس کی	اس کی
۲۰۱	٦	مین	میں
۲۰۲	۱	ھین	ھیں
۲۰۳	۱۱	اس کا	اُس کا
۲۰٤	۹	ان کو	اُن کو
۲۰۸	۲	مری بالیں	مرے بالیں
۲۲۳	٤	پانوں	پانو
۲۲٤	۱۰	وعدہ	عہد
۲۲٥	۸	بناو	بناو،
۲۳۳	٦	رکھدوں	رکھدیں
۲۷۳	۲	ھر اك	ھر یك
۲۷۳	٤	کی قامت	کے قامت
۲۸۷	٦	متاع	متاعِ